

تفسير احمد

سُورَةُ عَبَسَ

Ketabton.com

جزء - 30

سوره «عبس» کا تفسیر و ترجمہ

تصنيف: امين الدين « سعیدی - سعيد افغانی »

بسم الله الرحمن الرحيم

سورة عَبَسَ

جزء (30)

یہ سورہ مکہ میں نازل ہوئی ہے ، اس کی 42 آیات ہیں

وجہ تسمیہ:

یہ سورہ بہ سبب ذکر عَبَسَ کے سورہ عبس کہلاتی ہے عَبَسَ "عبوست" سے ہے ، یعنی منہ چڑھانا، جو کہ انسان کی عادت و اوصاف میں سے ہے ، یہ کیفیت اس وقت انسان پر ظاہر ہوتی ہے ، جب کام میں مصروف ہو ، اس لیے عَبَسَ نام رکھا گیا ۔

اس سورت کا نام پہلی آیت سے لیا گیا ہے ، مگر قابل ذکر بات یہ ہے کہ عَبَسَ صرف اس سورت کا نام ہے ، اس کے مضامین میں سے کسی بھی مضمون کا عنوان نہیں ہے۔

عَبَسَ: عُبُوس یا عُبُوس کے مادے سے لیا گیا ہے ، عُبُوس یا عُبُوس اس کے لیے کہا جاتا ہے جو چہرہ پھیر لیتا ہے یا سکر لیتا ہے ، ظاہری منہ موڑنے کی کیفیت اندرونی حالت کی غماز ہے۔

سورہ عَبَسَ کی آیات، کلمات اور حروف کی تعداد:

سورہ عَبَسَ کو سورہ سَفَر بھی کہا جاتا ہے ، اس سورت میں ایک رکوع ، (42) آیتیں اور ایک سو تینتیس (133) الفاظ ہیں ، (552) پانچ سو باون حروف اور (292) دوسو بیانوے نقطے ہیں۔

سورہ عَبَسَ کا سبب نزول:

مفسرین اس سورت کے سبب نزول کے بارے میں کہتے ہیں کہ: یہ سورت بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا کے خالہ زاد بھائی حضرت عبد اللہ ابن ام مکتوم کے بارے میں نازل ہوئی ہے ، ان کے واقعہ کو مفسرین کرام نے اس انداز سے بیان کیا ہے:

عبد اللہ ابن ام مکتوم جو نا بینا تھے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے تو اس وقت قریش کے بڑے بڑے سردار جن میں: عتبہ بن شیبہ ، ربیعہ کے دونوں بیٹے ، ابوجہل بن ہشام ، عباس بن عبدالمطلب ، امیہ بن خلف اور ولید بن مغیرہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے ، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اسلام کی دعوت دے رہے تھے ، اس امید پر کہ ان کے اسلام لانے سے جو کہ قوم کے بڑے ہیں باقی لوگ بھی مسلمان ہو جائیں گے۔

اسی دوران عبد اللہ بن ام مکتوم نے کہا: اے اللہ کے رسول ! آپ پڑھیے اور مجھے سکھائیے جو کچھ اللہ نے آپ کو سکھایا ہے ، عبد اللہ بن ام مکتوم اپنی

بات دوہراتے رہے ، ان کو معلوم نہیں تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے سرداروں کو دعوت دینے میں مصروف ہیں ۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ بات ناگوار گذری چہرہ مبارک ناخوشی کے عالم میں پھیر دیا اور منہ موڑا ان سے (جس سے چہرے میں عبوس ظاہر ہو گئی) اسی وقت یہ سورہ نازل ہوئی۔

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابن ام مکتوم کی تعظیم و تکریم کرتے تھے ، اور جب ان کو دیکھتے تو فرماتے " مرحبًا بمن عاتبنی فیہ ربی " خوش آمدید اس کے لیے جس کی وجہ سے رب نے مجھے سرزنش کی۔

پھر ان سے کہتے تھے: کیا آپ کو کوئی کام یا کچھ ضرورت ہے؟ میں تیار ہوں تمہارے کام اور ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ۔

اہل سیر لکھتے ہیں کہ: پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مرتبہ اسے مدینہ منورہ میں بحیث والی کے مقرر فرمایا، جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم غزوات پر تشریف لیجاتے تھے ۔

ایک روایت میں ہے کہ اس سورت کے نزول کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی بھی فقیر سے چہرہ نہیں پھیرا اور نہ ہی کسی سرمایہ دار اور سردار کے کام میں خود کو مشغول رکھا۔

اللہ تعالیٰ کی طرف سے غائب کا صیغہ استعمال کیا یعنی کہ پیغمبر اسلام کو مخاطب نہیں فرمایا: (عبس وتولی) (تیوری چڑھائی اور منہ موڑا ، جب آیا اس کے پاس ایک نابینا) یعنی: رب تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ : تو نے تیوری چڑھائی اور منہ موڑا ، اس انداز میں کئی باتیں ہیں جو چند امور کو واضح کرتی ہیں:

1- تربیت

2- اظہار غصہ

3- انسان اور اس کی رسالت کے حدود کا تعین اور اس کے لیے رہنمائی یہ بذات خود قرآن کے اعجاز کی ایک صورت ہے کہ ایک خاص انداز تکلم اپنایا گیا ہے۔

صحابی بننے کی شرائط

علماء کرام صحابہ بننے کے بارے میں فرماتے ہیں:

صحابی بننے کی شرائط میں سے ایک شرط آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیدار ہے ، کیا نابینا شخص ابن ام مکتوم جیسے جو پیارے نبی کریم ﷺ کی حضور میں موجود تھا صحابہ میں سے شمار ہوگا یا نہیں؟

اس کے جواب میں یہ کھنا چاہیے کہ صحابی ہونے کی شرائط مندرجہ ذیل ہیں:

1 - کوئی بھی شخص جس نے زندگی میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی ہو۔

2 - نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا ہو ، اور بحالت ایمان دنیا سے رخصت ہو گیا ہو۔

اب اگر اوپر والی دونوں شرائط کسی آدمی میں نہ پائی جائیں تو وہ صحابی شمار نہیں ہوگا۔

لیکن عبداللہ ابن ام مکتوم اگرچہ نابینا تھے، مگر مذکورہ دونوں شرائط رکھتے تھے ، اس لیے کہ صحابی ہونے کا شرط آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کا دیدار نہیں ، بلکہ آپ سے ملاقات کا ہے۔

ملاقات: یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے محضر میں حاضری ، اس لیے ملاقات اور دیدار میں فرق ہے ، علماء نے دیدار کی نہیں ، بلکہ ملاقات کی شرط رکھی ہے۔

مثال کے طور پر اویس قرنی اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں آپ پر ایمان لائے، اور اسلام پر بھی فوت ہوئے ، لیکن چونکہ وہ پیارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات میں کامیاب نہیں ہوئے، اس لیے وہ صحابی نہیں کہلائے۔

سورہ عبس کا عمومی خلاصہ :

اگر ہم سورہ عبس کے مشتملات پر مجموعی طور پر نظر ڈالیں ، تو ہم دیکھیں گے اس سورت کا خلاصہ پانچ بنیادی عنوانات میں کیا گیا ہے ۔

1 - خدا تعالیٰ کا سرزنش کرنا توجہ دلانا ایسے بندے کو جس نے حق کے متلاشی نا بینا شخص سے مناسب رویہ نہیں رکھا۔

2 - قرآن کریم کا مرتبہ و مقام ۔

3 - انسان کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناشکری ۔

4 - خدا تعالیٰ کی بعض نعمتوں کا اظہار ۔

5 - یامت ، مؤمنوں اور کافروں کا انجام ۔

سورة عبس

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

عَبَسَ وَتَوَلَّى ۚ ۱ اَنْ جَاءَهُ الْاَعْمَى ۚ ۲ وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهٗ يَزْكٰى ۚ ۳ اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهٗ ۚ ۴ الذِّكْرٰى ۚ ۵ اَمَّا مَنْ اسْتَعْٰى ۚ ۶ فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدِّى ۚ ۷ وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزْكٰى ۚ ۸ وَاَمَّا مَنْ جَاءَكَ يَسْعٰى ۚ ۹ وَهُوَ يَخْشٰى ۚ ۱۰ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهٰى ۚ ۱۱ كَلَّا اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۚ ۱۲ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرْهَا ۚ ۱۳ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۚ ۱۴ مَرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۚ ۱۵ بِاَيْدِي سَفَرَةٍ ۚ ۱۶ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۚ ۱۷ قُلِ الْاِنْسَانُ مَا اَكْفَرُ ۚ ۱۸ مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ ۚ ۱۹ خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ ۚ ۲۰ ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسِّرَهُ ۚ ۲۱ ثُمَّ اَمَاتَهُ فَاَقْبَرَ ۚ ۲۲ ثُمَّ اِذَا شَاءَ اَنْشَرَهُ ۚ ۲۳ كَلَّا لَمَّا يُفْضِ مَا اَمَرَهُ ۚ ۲۴ فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلَى طَعَامِهِ ۚ ۲۵ اَنَا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ۚ ۲۶ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۚ ۲۷ فَاَنْبَتْنَا فِيْهَا حَبًّا ۚ ۲۸ وَعَبْنَا وَقَضَبْنَا ۚ ۲۹ وَزَيْتُوْنًا وَنَخْلًا ۚ ۳۰ وَحَدَاقٍ غُلْبًا ۚ ۳۱ وَفَاكِهَةً وَّ اَبًّا ۚ ۳۲ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلَآ اَنْعَامِكُمْ ۚ ۳۳ فَاِذَا جَاءَتِ الصَّآخَةُ ۚ ۳۴ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۚ ۳۵ وَاُمِّهِ وَاَبِيْهِ ۚ ۳۶ وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيْهِ ۚ ۳۷ لِكُلِّ اَمْرٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُّغْنِيْهِ ۚ ۳۸ وَجُوْهُ يَوْمَئِذٍ مُّسْفَرَةٌ ۚ ۳۹ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۚ ۴۰ وَوُجُوْهُ يَوْمَئِذٍ عَلِيْهَا غَبْرَةٌ ۚ ۴۱ تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ ۚ ۴۲ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرَةُ الْفَجَرَةُ ۚ ۴۳

سورت کا لفظی ترجمہ

بسم الله الرحمن الرحيم	شروع اللہ کا نام لے کر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
عَبَسَ وَتَوَلَّى ۚ ۱	(محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ترش رو ہوئے اور منہ پھیر بیٹھے (۱)
اَنْ جَاءَهُ الْاَعْمٰى ۚ ۲	جب آیا ان کے پاس ایک نا بینا (2)
وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهٗ يَزْكٰى ۚ ۳	اور تم کو کیا خبر شاید وہ پاکیزگی حاصل کرتا (3)
اَوْ يَذَّكَّرُ فَتَنْفَعَهٗ ۚ ۴	یا سوچتا تو سمجھانا اسے فائدہ دیتا (3)
اَمَّا مَنْ اسْتَعْٰى ۚ ۶	جو پروا نہیں کرتا (۴)
فَاَنْتَ لَهٗ تَصَدِّى ۚ ۷	اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو (۵)
وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَزْكٰى ۚ ۸	حالانکہ وہ نہ سنوے تو تم پر کچھ (الزام) نہیں (۶)
وَاَمَّا مَنْ جَاءَكَ يَسْعٰى ۚ ۹	اور جو تمہارے پاس دوڑتا ہوا آیا (۷)
وَهُوَ يَخْشٰى ۚ ۱۰	اور (خدا سے) ڈرتا ہے (۸)
فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهٰى ۚ ۱۱	اس سے تم بے رخی کرتے ہو (۹)

دیکھو یہ (قرآن) نصیحت ہے (۱۰)	كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝۱۰
پس جو چاہے اسے یاد رکھے (۱۱)	فَمَنْ شَاءَ ذَكَرْهُ ۝۱۱
قابل ادب و رقوق میں (لکھا ہوا) (۱۲)	فِي صُحُفٍ مُّكْرَمَةٍ ۝۱۲
جو بلند مقام پر رکھے ہوئے (اور) پاک ہیں (۱۳)	مَرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝۱۳
لکھنے والوں کے ہاتھوں میں (۱۴)	بِأَيْدِي سَفَرَةٍ ۝۱۴
جو سردار اور نیکو کار ہیں (۱۵)	كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝۱۵
انسان ہلاک ہو جائے کیسا ناشکرا ہے (۱۶)	قُلِ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ ۝۱۶
اسے (خدا نے) کس چیز سے بنایا (۱۷)	مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقْتَهُ ۝۱۷
نطفے سے بنایا ، پھر اس کا اندازہ مقرر کیا (۱۸)	مِنْ نُّطْفَةٍ ۝ خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ ۝۱۸
پھر اس کے لیے رستہ آسان کر دیا (۱۹)	ثُمَّ السَّبِيلَ يَسَّرَهُ ۝۱۹
پھر اسکو موت دی، پھر قبر میں دفن کرایا (۲۰)	ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ ۝۲۰
پھر جب چاہے گا اسے اُٹھا کھڑا کرے گا (۲۱)	ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنشَرَهُ ۝۲۱
کچھ شک نہیں کہ خدانے اسے جو حکم دیا اس نے اس پر عمل نہ کیا (۲۲)	كَلَّا لَمَّا يُفْضِ مَا أَمَرَهُ ۝۲۲
تو انسان کو چاہیئے کہ اپنے کھانے کی طرف نظر کرے (۲۳)	فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَى طَعَامِهِ ۝۲۳
بیشک ہم ہی نے پانی برسایا (۲۴)	إِنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ۝۲۴
پھر ہم ہی نے زمین کو چیرا پھاڑا (۲۵)	ثُمَّ شَفَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ۝۲۵
پھر ہم ہی نے اس میں اناج اُگایا (۲۶)	فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ۝۲۶
اور انگور اور ترکاری (۲۷)	وَعِنَبًا وَقَضْبًا ۝۲۷
اور زیتون اور کھجوریں (۲۸)	وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا ۝۲۸
اور گھنے گھنے باغ (۳۰)	وَحَدَاقٍ غُلْبًا ۝۳۰
اور میوے اور چارا (۳۱)	وَفَاكِهَةً وَأَبًّا ۝۳۱
(یہ سب کچھ) تمہارے اور تمہارے چارپایوں کیلئے بنایا (۳۲)	مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ۝۳۲
تو جب (قیامت کا) غل مچے گا (۳۳)	فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاحَّةُ ۝۳۳
اس دن بھائی اپنے بھائی سے دور بھاگے گا (۳۴)	يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۝۳۴
اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے (۳۵)	وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ ۝۳۵

وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ۖ	اور اپنی بیوی اور بیٹوں سے (۳۶)
لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ۖ	ہر شخص اس روز ایک فکر میں ہوگا، جو اسے بے پروا کر دے گا (۳۷)
وَجُوهٌ يُّوْمِئِذٍ مُّسْفَرَةٌ ۖ	اور کتے چہرے اس روز چمک رہے ہوں گے (۳۸)
ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۖ	خندان و شادان (یہ مؤمنان نیکوکار ہیں) (۳۹)
وَوُجُوهٌ يُّوْمِئِذٍ عَلَيَهَا غَبَرَةٌ ۖ	اور کتے چہرے ہونگے جن پر گرد پڑ رہی ہوگی (۴۰)
تَرْبُقًا قَفَرًا ۖ	(اور) سیاہی چڑھ رہی ہوگی (۴۱)
أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرَةُ الْفَجَرَةُ ۖ	یہ کفار بدکردار ہیں (۴۲)

تفسیر سورۃ عبس

محترم قارئین:

مبارک آیات (1 تا 10) اسلام جیسے مقدس دین میں مساوات اور برابری کے بارے میں بحث کی گئی ہے۔

بسم الله الرحمن الرحيم	شروع خدا کا نام لے کر جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے
عَبَسَ وَتَوَلَّى ۖ	(محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ترش رو ہوئے اور منہ پھیر بیٹھے (۱)

یعنی: پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے کفار کے بعض بزرگوں کو دعوت دینے میں مصروف ہونے کی وجہ سے چہرہ پھیر لیا، یعنی: منہ موڑ لیا اور نابینا کے سوال پر متوجہ نہیں ہوئے، اگرچہ ان لوگوں کی غیر موجودگی میں اس کے ساتھ نرمی اور محبت کے ساتھ مخاطب ہوئے۔

أَنْ جَاءَهُ الْأَعْمَى ۖ	جب آیا ان کے پاس ایک نابینا (۲)
---------------------------	---------------------------------

احمد بن محمد الصّاوٰی المالکی الخلوٰتی مؤلف حاشیہ علی تفسیر جلالین فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور احترام کے اظہار کے لیے خدا تعالیٰ نے غایب کے ضمائر "عَبَسَ وَتَوَلَّى" استعمال کیے ہیں، اس لیے سختی اور سرزنش کی جو شدت "تاء" خطاب "عَبَسَتْ و تولیت" میں ہے وہ ناقابل انکار ہے، نابینا شخص کا نام "عبد اللہ ابن ام مکتوم" تھا، سرزنش کرنے والی آیات کے نزول کے بعد جب بھی آپ کے پاس آتے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے: "خوش آمدید اس کے لیے جس کی وجہ سے رب نے مجھے سرزنش کی، اور اپنی چادر بچھا دیتے تاکہ وہ بیٹھ جائیں، (تفسیر صفوة التفاسیر)۔

"اعْمَى" عَمَى کے مادے سے ہے، اور عَمَى: یعنی: بَصَرَ اور بصیرت کا فقدان، آنکھوں کی بینائی یا دل کی آنکھ کے ختم ہونے کے لیے استعمال ہوا ہے۔

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهٗ يَزْكِي ۝۳	اور تم کو کیا خبر شاید وہ پاکیزگی حاصل کرتا (۳)
--------------------------------------	---

"لَعَلَّهٗ يَزْكِي" شاید اس کا دل گناہوں سے پاک ہو کر سچ جائے، "يَزْكِي": ایسے نیک عمل کرے جو گناہوں کو دھو ڈالیں۔

علامہ عبد الرحمن سعدی عصر حاضر کے مفسرین میں سے ہیں فرماتے ہیں: "ان آیات کریمہ کا سبب نزول یہ ہے کہ: مؤمنوں میں سے ایک نابینا آدمی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تا کہ آپ سے پوچھے اور سیکھے، اسی دوران ایک امیر آدمی بھی آیا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کی ہدایت اور رہنمائی کرنے میں بہت زیادہ حریص تھے، اس وجہ سے پیامبر صلی اللہ علیہ وسلم امیر آدمی کے طرف متوجہ ہوئے اور نابینا شخص سے بے توجہی برتی، تاکہ اس امیر و سرمایہ دار آدمی کی رہنمائی کریں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم امیر شخص کی ہدایت پانے اور پاکیزہ ہونے میں زیادہ دلچسپی رکھی۔ پھر رب تعالیٰ نے پیغمبر اسلام نبی علیہ السلام کو نرمی کے ساتھ متوجہ کیا یا سرزنش کی اور فرمایا: "عَبَسَ وَ تَوَلَّى" فقیر سے منہ موڑا اور اپنا رُخ اس امیر آدمی کی طرف کر دیا، پھر آپ ﷺ کی توجہ کے سبب بیان فرمایا:

"وما يدريك لعله يزكى" (تجھے کیا معلوم؟ شاید یہ نابینا برے اخلاق سے پاک ہو جائے، اور اچھے اخلاق سے آراستہ ہو جائے، "أَوَيَذْكُرُ فِتْنَفَعَهُ الذِّكْرُ" یا یہ کہ جو کچھ اس کو فائدہ پہنچاتا ہے اسے قبول کر لے، اور اس نصیحت سے فائدہ اٹھالے، یہ بہت بڑا فائدہ ہے، پیغمبروں کی بعثت اور واعظین کے وعظ اور نصیحت کرنے والوں کی نصیحت کا یہی مقصد ہے۔

پھر آپ ﷺ کی توجہ اس شخص کی طرف زیادہ مناسب اور ضروری ہے جو آپ پاس چل کر آیا ہے، خود کو آپ کا محتاج سمجھتا ہے۔

لیکن آپ کا توجہ کرنا اس امیر آدمی کی طرف جو خود کو بے نیاز سمجھتا ہے نہ پوچھتا ہے اور نہ ہی خیر میں دلچسپی رکھتا ہے، اور چھوڑ دینا ایسے شخص کو جو اس امیر آدمی سے زیادہ مستحق ہے یہ آپ کے شایان شان نہیں ہے، اس لئے کہ اگر وہ امیر آدمی پاک نہ ہو جائے تو آپ پر کوئی گناہ نہیں، اور اس کے برے اعمال کے متعلق آپ سے نہیں پوچھا جائے گا۔

کسی یقینی کام کو ظنی کام کی وجہ سے نہیں چھوڑا جاسکتا ہے
مفسرین کہتے ہیں: یہاں ایک مشہور قاعدہ ہے:

"کسی معین و معلوم چیز کو بے بنیاد اور خیالی چیز کی وجہ سے ترک نہیں کیا جاسکتا" یقینی اور ادراک شدہ مصلحت کو فرضی مصلحت کی بنیاد پر ترک نہیں کرنا چاہیے، وہ طالب علم جو تعلیم میں دلچسپی رکھتا ہے، اور جس کو علم کی ضرورت ہے اس پر زیادہ توجہ دینی چاہیے، بہ نسبت اس کے کہ جو ایسا نہیں ہے، یہ بات قابل ذکر ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ طرز عمل ترک افضل میں شمار ہوتا ہے۔

لہذا آپ ﷺ کا یہ کام نہ گناہ تھا اور نہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت سے متصادم تھا، کیونکہ ان سے اس کام کے سرزد ہونے کی وجہ وہ چیز ہے جو انسانی فطرت کے تابع ہے، جیسے: غصہ، رضا، ہنسی، اور رونا، یعنی: ایسے امور جس پر شریعت نے مکلف نہیں بنایا ہے، ابن أم مكتوم کا عذر بھی یہی تھا کہ ان کو معلوم نہیں تھا، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں کے ساتھ مصروف ہیں، اور اس امید و خواہش کے ساتھ ان سے گفتگو کر رہے ہیں کہ یہ اسلام قبول کر لیں۔

اَوْ يَذْكُرُ فَنَنْفَعَهُ الدِّكْرَىۥ	یا سوچتا تو سمجھانا اسے فائدہ دیتا (۴)
--	--

مفسر تفسیر انوار القرآن اس آیت مبارکہ کے تحت لکھتے ہیں: لہذا آپ ﷺ کا یہ کام نہ گناہ تھا اور نہ انبیاء علیہم السلام کی عصمت سے متصادم تھا، کیونکہ ان سے اس کام کے سرزد ہونے کی وجہ فطری ہے، جیسے: غصہ، رضا، ہنسی، اور رونا، یعنی: ایسے امور جن پر شریعت نے مکلف نہیں بنایا ہے، ابن أم مكتوم کا عذر بھی یہی تھا کہ ان کو معلوم نہیں تھا، کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دوسروں کے ساتھ مصروف ہیں، اور اس امید و خواہش کے ساتھ ان سے گفتگو کر رہے ہیں کہ یہ اسلام قبول کر لیں۔

اَمَّا مَنْ اسْتَغْنَىۥ	جو پروا نہیں کرتا (۵)
-------------------------	-----------------------

یعنی: جو شخص اپنے مال اور دولت اور مقام کی وجہ سے خود کو ایمان، علم اور دین سے بے نیاز سمجھتا ہے اور کلمہ حق اور دعوت دین اور اللہ کے کلام کو سننے سے خود کو لاپرواہ اور اسے اپنے لیے غیر ضروری سمجھتا ہے، اور جھوٹی امیری نے اسے سرکش بنا دیا ہے، تو ان کی طرف توجہ کرتا ہے؟

فَأَنْتَ لَهُ تَصَدَّىۥ	اس کی طرف تو تم توجہ کرتے ہو (۶)
-------------------------	----------------------------------

یعنی: آپ اس کی طرف متوجہ ہو کر اس سے بات کرتے ہیں، جب کہ وہ اپنی دولت اور مالدار کی زیر اثر آپ سے بے نیازی کا اظہار کرتا ہے، اور جو کچھ آپ لے کر آئے اس سے منہ موڑ لیتا ہے۔

وَمَا عَلَيْكَ اَلَّا يَرْكَبُۥ	حالانکہ وہ نہ سنوے تو تم پر کچھ (الزام) نہیں (۷)
---------------------------------	--

اگر وہ اپنے گناہوں سے پاک نہ ہو تو تجھے کوئی نقصان نہیں کہ اس کی وجہ سے اس کی ہدایت پانے کے لیے زیادہ کوشش میں ہو۔

وَأَمَّا مَنْ جَاءَكَ يَسْعَى ۝۸ اور جو تمہارے پاس دوڑتا ہوا آیا (۸)

"یَسْعَى" یعنی: خیر کی طلب علم اور رہنمائی کی تلاش میں تمہاری طرف دوڑتا ہے۔

وَبُؤِيسَخْسَى ۝۹ اور (خدا سے) ڈر تاہے (۹)

یعنی: وہ اللہ کے عذاب اور اس کی سزا سے ڈرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ڈر ہی آپ سے سوال کرنے کا سبب بنا تاکہ حلال کو جان لے اور اس پر عمل کرے، اور حرام کو پہچان کر اس سے بچے، جی ہاں! اللہ کے ڈر کے ساتھ نجات مل سکتی ہے۔

فَأَنْتَ عَنْهُ تَلَهَّى ۝۱۰ اس سے تم بے رخی کرتے ہو (10)

ابن کثیر کہتے ہیں کہ: اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا ہے کہ تبلیغ اور تحذیر کے کام میں کسی کو خاص نہ بنائیں، بلکہ برتر اور کمتر، فقیر اور مالدار، آقا اور غلام، مرد اور عورت، چھوٹے اور بڑے سب کو حق کا پیغام پہنچانے میں برابر رکھیں۔

محترم قارئین !

آیات مبارکہ (11 تا 23) میں ان موضوعات کے بارے میں بحث کی گئی ہے، کہ (1) یہ قرآن ہدایت ہے، (2) خدا کی نعمتوں کی ناشکری، (3) مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا۔

كَلَّا إِنَّهَا تَذْكِرَةٌ ۝۱۱ دیکھو یہ (قرآن) نصیحت ہے (۱۱)

رب تعالیٰ فرماتے ہیں: بے شک یہ وعظ و نصیحت اللہ کی طرف سے ہے، اور اس لیے ہے کہ انسانوں کو نصیحت حاصل ہو، اور یہ وہ چیز ہے جس کی بندوں کی ضرورت ہے، پھر جب یہ واضح ہو گیا تو فرمایا: "فَمَنْ شَاءَ ذَكَرْهُ" جو شخص چاہے اس پر عمل کرے۔

جیسا کہ رب تعالیٰ نے ایک اور جگہ فرمایا ہے: "وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفِرْ" اور کھدو کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے، تو جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کافر رہے۔

پھر اس نصیحت کی اہمیت، مقام و مرتبہ کو بیان کر کے فرمایا:

فَمَنْ شَاءَ ذَكَرْهُ ۝۱۲ پس جو چاہے اسے یاد رکھے (۱۲)

جو شخص پسند کرتا ہے کہ قرآن کریم کی نصیحتوں سے فائدہ اٹھائے تو ایسا عمل کرے، یعنی: خود کو وحی کے ذریعے مہذب بنائے، اپنے رویے اور عمل کو دین کے ساتھ مضبوط بنائے، اور عمل صالح کے ساتھ نفع بخش علم سے استفادہ کرے۔

فِي صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝۱۳	قابل ادب ورقوں میں (لکھا ہوا) (۱۳)
-----------------------------	------------------------------------

مقدس اور پاک صحیفے جو اونچے مقام و مرتبہ والے اور ہر قسم کی آفت اور شیطان کی دست رس سے دور ہیں، بلکہ یہ صحیفے: "بِأَيْدِي سَفَرَةٍ" لکھنے والوں کے ہاتھوں میں ہیں یہ وہ فرشتے ہیں جو اللہ اور بندوں کے درمیان سفیر ہیں۔

مَرْفُوعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝۱۴	جو بلند مقام پر رکھے ہوئے (اور) پاک ہیں (۱۴)
------------------------------	--

"تفہیم القرآن" کے مفسر لکھتے ہیں: یعنی: ہر قسم کی آمیزشوں سے پاک ہے، ان میں خالص حق کی تعلیم پیش کی گئی ہے، کسی بھی نوعیت کے باطل اور فاسد افکار و نظریات ان میں راہ نہیں پاسکتے، جن آلودگیوں سے دنیا کی دوسری مذہبی کتابیں آلودہ کردی گئی ہیں، ان کا کوئی ادنیٰ سا شائبہ بھی ان کے اندر داخل نہیں ہوسکا ہے، انسانی تخیلات ہوں، یا شیطانی وساوس، ان سب سے یہ پاک رکھے گئے ہیں۔

"مُطَهَّرَةٍ": مُطَهَّرٌ: طہر اور طہارت کے مادے سے ہے، یہ جسم کی پاکیزگی ہوسکتی ہے، اور روح و نفس کی پاکیزگی بھی۔
"مَرْفُوعَةٍ" آسمان میں بلند اور اونچا۔

بِأَيْدِي سَفَرَةٍ ۝۱۵	(ایسے) لکھنے والے کے ہاتھوں میں (۱۵)
------------------------	--------------------------------------

"سَفَرَةٍ" (سفیر: لکھنے والے) سفرہ: وہ فرشتے ہیں جو اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء کے درمیان وحی پہنچانے کا کام انجام دیتے ہیں، یہ سفارت کے مادے سے لیا گیا ہے جو لوگوں میں اصلاح لانے کے لیے رفت و آمد کرے۔
مفسرین حضرات اس لفظ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

- 1- اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حفاظ قرآن۔
- 2- وہ فرشتے اور ملائک جو انسانوں کے لیے خدا کے سفیر ہیں، وہ فرشتے جو اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار اور مطیع ہیں، جنہوں نے اس قرآن کو لوح محفوظ میں درج کر رکھا ہے، فرشتوں کی ان صفات میں ہر وہ شخص شامل ہے جو مؤمن، نرم دل، پاکیزہ نیت والا، حافظ اور اللہ کی کتاب پر عمل کرنے والا ہو، وہ مؤمن جو قرآن کو ہاتھ میں لے کر اس کی تلاوت کرتا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (مَثَلُ الَّذِي يَقْرَأُ الْقُرْآنَ وَهُوَ حَافِظٌ لَهُ مَعَ السَّفَرَةِ الْكِرَامِ الْبَرَّةِ) ترجمہ: "جو شخص قرآن پڑھتا ہے اور وہ اس کا حافظ بھی ہو، وہ معزز اور نیک سفراء (فرشتوں) کے ساتھ ہوگا۔"

كِرَامٍ بَرَرَةٍ ۝۱۶	جو سردار اور نیکو کار ہیں (۱۶)
----------------------	--------------------------------

اس سے مراد وہ فرشتے ہیں جو اپنے رب کی بارگاہ میں بزرگ اور معزز ہیں، (لَا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ) جنہیں جو حکم اللہ تعالیٰ

دیتا ہے اس کی نافرمانی نہیں کرتے، اور جو حکم دیا جائے بجالاتے ہیں، وہ گناہوں کی گندگی سے محفوظ ہیں اور عیبوں کے اثر سے آزاد ہیں۔

قَتَلَ الْإِنْسَانَ مَا أَكْفَرَهُ ۝۱۷ (انسان ہلاک ہو جائے کیسا ناشکرا ہے (۱۷))

(قَتَلَ الْإِنْسَانَ) "کافر آدمی پر لعنت" (مَا أَكْفَرَهُ) کیسا ناشکر انسان ہے، کتنا بے ایمان کافر ہے۔

اللہ تعالیٰ کافر پر لعنت کرے اس کا کفر کتنا شدید اور اس کا انکار کتنا بڑا ہے، احسان فراموش ہے، اور رحمت والے رب کی نافرمانی کرتا ہے، شیطان کی اطاعت کر کے قرآن کو جھٹلاتا ہے۔

شان نزول آیت 17:

ابن منذر عکرمہ سے نقل کر کے فرماتے ہیں: جب ابولہب کے بیٹے "عتبہ" نے کہا: "کفرت برب النجم" میں ستاروں کے رب پر یقین نہیں رکھتا، یہ آیہ کریمہ نازل ہوئی۔

مِنْ أَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهُ ۝۱۸ (اسے (خدا نے) کس چیز سے بنایا (۱۸))

کہ اس طرح تکبر کر کے انکار کرتا ہے۔

مِنْ نُطْفَةٍ ۝ خَلَقَهُ فَقَدَّرَهُ ۝۱۹ (نطفے سے بنایا، پھر اس کا اندازہ مقرر کیا (۱۹))

یعنی اس نے اسے ہزاروں نطفوں میں سے کم حیثیت والے پانی سے پیدا کیا، کہ اللہ نے اسے حکم دیا ہے، لہذا اس کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ تکبر کرے؟ "فَقَدَّرَهُ" اس کے لیے ایک اندازہ مقرر کر دیا۔

ابن کثیر فرماتے ہیں: اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اس کی موت اور عمل کا وقت متعین کر لیا ہے، اور یہ طے کر لیا ہے کہ وہ نیک بخت ہے یا بد بخت۔ (مختصر: 600/3)

مفسرین اپنی تفاسیر میں اس آیت کے متعلق لکھتے ہیں:

1- اللہ تعالیٰ نے انسان کو مرد کے تناسل کی نالی اور عورت کے رحم میں ایک حقیر نطفے سے پیدا کیا ہے، پہلے نطفہ سے اور پھر علقہ اور خون کے لوتھڑے سے اور پھر گوشت کے ایک ٹکڑے سے تو تم کیوں تکبر کرتے ہو؟

2- اے انسان تو تو ایک حقیر نطفہ تھا، پھر اللہ نے تیرے جسم کے تمام اعضاء بنائے، اور تجھے خوبصورت اور مکمل بنایا تو کیوں غرور کرتا ہے؟

3- اللہ تعالیٰ نے تجھے کھڑے ہونے کی طاقت دی ہے اور تجھے کامل اور نعمتوں سے بھرا ہوا پیدا کیا ہے تو تم کیوں تکبر کرتے ہو؟

4- اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک حقیر نطفے سے اور کئی مراحل میں پیدا کیا ہے، سب سے پہلے نطفہ، پھر علقہ، اس کے بعد مضغہ، تو کیا جس کی حالت ایسی ہو اس کے لیے مناسب ہے کہ اللہ کا انکار کر کے متکبر بن جائے،

اور رب سے خود کو بے نیاز سمجھے؟ انسان کو چاہیے کہ اپنی ابتداء، انتہاء اور درمیان کو دیکھے، اس کی ابتداء ایک بوسیدہ نطفہ ہے اور اس کا انجام بدبودار لاش اور ان دونوں کے درمیان نجاست ہے، تو ایسے انسان کیوں کفر کرے اور کیوں تکبر کرے۔

ثُمَّ السَّبِيلَ يَسْرُهُ ۝۲۰ پھر اس کے لیے رستہ آسان کر دیا (۲۰)

یعنی: پھر ماں کے پیٹ سے نکلنے کا راستہ، اس کے روزی کا راستہ، اس کی خوشی کا راستہ سہل اور آسان بنادیا، اگر اللہ تعالیٰ ماں کے پیٹ سے نکلنے کا راستہ آسان نہ بناتا تو کیسے پیدا ہوتا؟

حسن بصریؒ فرماتے ہیں: وہ آدمی جو تناسل کی نالی سے دو دفعہ نکلا وہ کیسے تکبر کرتا ہے، (تفسیر قرطبی: 216/19)۔

لیکن جیسا کہ اس نے باہر سے وحی بھیجی ہے، اندر سے اس نے ہنراور صلاحیتیں دی ہیں تاکہ انسان قدم بہ قدم وحی پر عمل کرسکے اور اس کے مطابق زندگی گزارے۔

ثُمَّ أَمَاتَهُ فَأَقْبَرَهُ ۝۲۱ پھر اسکو موت دی، پھر قبر میں دفن کرایا (۲۱)

یعنی: اس کے لیے عزت کے طور پر قبر مقرر کی ہے تاکہ اس میں چھپ جائے، ورنہ یہ سڑ جاتا اور بدبو پکڑتا، اور وحشی جانوروں، درندوں اور پرندوں کی خوراک بن جاتا۔

خازن نے کہا: اس طرح اس نے انسانوں کو دوسرے جانوروں پر فضیلت دی ہے۔

ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنْشَرَهُ ۝۲۲ پھر جب چاہے گا اسے اُٹھا کھڑا کرے گا (۲۲)

یعنی: مرنے کے بعد اسے حشر اور جزا و سزا اور حساب کتاب کے لیے زندہ کرے گا، (تفسیر خازن: 210/4)

"إِذَا شَاءَ" جب اللہ تعالیٰ چاہے گا اور حکم کرے گا یہ وقت اور زمانہ ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔

كَأَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَا أَمَرَهُ ۝۲۳ کچھ شک نہیں کہ خدانے اسے جو حکم دیا اس نے اس پر عمل نہ کیا (۲۳)

اس کافر کو اپنے غرور اور تکبر سے باز آنا چاہیے، کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر کردہ فریضہ کو ادا نہیں کیا اور وہ عبادات ادا نہیں کیں جو اللہ نے اس پر فرض کی ہیں۔

علامہ ابن کثیرؒ نے "كَأَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَا أَمَرَهُ" کو "ثُمَّ إِذَا شَاءَ أَنْشَرَهُ" سے متعلق رکھا ہے، یعنی جب چاہے گا زندہ کر کے اٹھائے گا، اور کسی کو بولنے کی جرأت اور گنجائش نہیں ہے، ابھی ایسا نہیں کیا جاسکتا کیونکہ دنیا کی آبادی

کے متعلق اس کا جو حکم کوئی و قدری ہے وہ ابھی تک اس نے ختم نہیں کیا، "تفسیر کابلی"۔

(آیات مبارکہ : 24 تا 42) میں: الہی نعمتیں جن کی انسانوں کو ضرورت اور احتیاج ہے، اور قیامت کے دن کا خوف اور ڈر زیر بحث آیا ہے۔

توانسان کو چاہیئے کہ اپنے کھانے کی طرف نظر کرے (۲۴)	فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ إِلَى طَعَامِهِ ۚ ۲۴
---	--

اس مبارک آیت میں کھانے کی طرف توجہ کرنے کی ضرورت کا ذکر کیا گیا ہے، بلاشبہ آیت کا ظاہری مفہوم وہ جسمانی غذائیں ہیں جن کی طرف آنے والی آیات میں اشارہ کیا گیا ہے، لیکن روح کی عذا کے لیے بھی ان آیات سے دلیل لی جاسکتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں: جیسا کہ انسان مرکب ہے روح اور جسم سے، جس طرح جسم کو مادی غذا کی ضرورت ہے اسی طرح روح کو بھی روحانی غذا کی ضرورت ہے۔

مفسرین کرام اپنی تفسیروں میں لکھتے ہیں کہ اس آیت کا معنی و مفہوم عام ہے۔

انسان کو چاہیے کہ اس خوراک کو دیکھے جو اس کی زندگی کا سرچشمہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور تدبیر سے کیسے کامل ہوا ہے، شاید پھر یہ اللہ کو یاد کرے اور اللہ کا شکر ادا کرے۔

بیشک ہم ہی نے پانی برسایا (۲۵)	إِنَّا صَبَبْنَا الْمَاءَ صَبًّا ۚ ۲۵
--------------------------------	---------------------------------------

یعنی: اپنی قدرت سے ہم نے شاندار طریقے سے بادلوں سے پانی برسایا، اس میں برکتیں، نشوونما اور زندگی ہے، انسانوں، حیوانوں اور پودوں کو زندگی فراہم کرتا ہے۔

پھر ہم ہی نے زمین کو چیرا پھاڑا (۲۶)	ثُمَّ شَقَقْنَا الْأَرْضَ شَقًّا ۚ ۲۶
--------------------------------------	---------------------------------------

اس کے بعد ہم نے زمین کی مٹی کو اس کے سائز کے مطابق پودے اگا کر، بغیر کسی زیادتی یا کمی کے، بلکہ حکمت کے ساتھ ہم نے اس کو پھاڑا تاکہ پودے کی کونپل اس سے نکل آئے، اس لیے اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے پھلوں کی اقسام میں سے اٹھ پھلوں کا ذکر کیا ہے۔

پھر ہم ہی نے اس میں اناج اُگایا (۲۷)	فَأَنْبَتْنَا فِيهَا حَبًّا ۚ ۲۷
--------------------------------------	----------------------------------

یعنی: نتیجے کے طور پر ہم نے زمین سے گندم، جو اور جوار کی فصل نکالی، تاکہ متعدد اقسام اور مختلف ذائقوں کے ساتھ انسانوں اور حیوانوں کی خوراک بنیں۔

اور انگور اور ترکاری (۲۸)	وَعِنَبًا وَقَضْبًا ۚ ۲۸
اور زیتون اور کھجوریں (۲۹)	وَزَيْتُونًا وَنَخْلًا ۚ ۲۹

اللہ تعالیٰ نے یہاں تین پہل: انگور، زیتون اور کھجور کا ذکر فرمایا، اور اس کی دلیل یہ ہے کہ ان پھلوں کی خصوصیات اور فوائد بہت زیادہ ہیں اور پھلوں کے بادشاہ کے طور پر معروف و مشہور ہیں۔

وَحَدَّثَنَا غُلَبًا ۝۳۰	اور گھنے گھنے باغ (۳۰)
--------------------------	------------------------

نخل: غلب: کھجور کا اصلی درخت، یہ مضبوط اور موٹا ہوتا ہے جو کہ بہت زیادہ ثمر آور اور کھجور کے باغات میں بڑی تعداد میں ہوتا ہے۔

وَفَاكِهَةً وَأَبًّا ۝۳۱	اور میوے اور چارا (۳۱)
--------------------------	------------------------

"فَاكِهَةً": ہر وہ چیز ہے جس کا پھل لوگ کھاتے ہیں، اسے عمومی طور پر ذکر کیا تاکہ اس کی تمام اقسام شامل ہوں۔

مفسر قرطبی فرماتے ہیں: "اب" ایسی گھاس کو کہتے ہیں جسے جانور کھاتے ہیں، (قرطبی: 220/19)۔

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِأَنْعَامِكُمْ ۝۳۲	(یہ سب کچھ) تمہارے اور تمہارے چارپایوں کیلئے بنایا (۳۲)
--	---

ابن کثیر فرماتے ہیں: یہ آیات بندوں کے احسان جھٹلانے پر دلالت کرتی ہیں، اور مردہ نباتات

کے اگنے کا ذکر کرتے ہوئے یہ استدلال کرتا ہے کہ وہ بوسیدہ ہڈیوں اور ٹوٹے ہوئے اعضاء بن جانے کے بعد دوبارہ اس طرح زندہ کئے جائیں گے۔ (مختصر 601/3)

فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاعَةُ ۝۳۳	تو جب (قیامت کا) غل مجھے گا (۳۳)
--------------------------------	----------------------------------

الصَّاعَةُ: ایک زور دار چیخ ہے، کانوں کے پردے پھاڑنے والی نفخہ ثانیہ ہوگا جس دن اسرافیل کی خوفناک آواز کانوں کو بہرا کر دے گی، اور دلوں میں خوف و ہراس بٹھائے گی، "صخ" ایک لوہے کو دوسرے لوہے پر مارنا، یا لاٹھی کا دوسری لاٹھی پر مارنا کہ جس سے کان پھاڑنے والی آواز پیدا ہو جائے۔ بیان فرمایا: دوسری دنیا میں قیامت اور بنی نوع انسان کے انجام کی وضاحت کی اور فرمایا: (فَإِذَا جَاءَتِ الصَّاعَةُ) شاید قیامت کو "صَّاعَةُ" کہنا اس بات کی دلیل ہو کہ نفخہ ثانیہ اتنی شدید اور سخت ہوگی کہ کانوں کو پھاڑ دے گی اور بہت سارے لوگ بہرے ہو جائیں گے اس کے بعد رب تعالیٰ فرماتے ہیں:

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۝۳۴	اس دن بھائی اپنے بھائی سے دور بھاگے گا (۳۴)
---	---

جس دن انسان اپنے بھائی سے قربت، شفقت اور رشتہ داری کے باوجود دور بھاگے گا، اس کا مطلب یہ ہے کہ بھائی چارہ اور فائدہ نفع کچھ بھی نہیں ہے کیونکہ حالات سب کچھ سے بڑھ کر ہے، قیامت بھاگنے کا دن ہے بھائی کا بھائی سے فرار، اولاد کا ماں باپ سے بھاگنا، شوہر بیوی سے اور باپ بیٹے سے۔

وَأُمِّهِ وَأَبْنَيْهِ ۝ اور اپنی ماں اور اپنے باپ سے (۳۵)

یعنی: روز قیامت محشر کے میدان میں حساب کتاب کے لیے کھڑے رہنا اس قدر ہولناک اور شدید ہوگا کہ انسان اپنے والدین سے بھاگے گا اور انہیں اپنی نیکیاں نہیں دیگا، جی ہاں! بعض ایسے امور نے اسے والدین سے مصروف کر دیا ہوگا کہ جس نے اس کی عقل چرا لی ہوگی، اس کے خیالات کو خوف زدہ کر دیا ہوگا، اور انکھوں کو بے حس کر دیا ہوگا۔

وَصَاحِبَتِهِ وَبَنِيهِ ۝ اور اپنی بیوی اور بیٹوں سے (۳۶)

کیونکہ حد سے زیادہ ڈر اور اس دن کی ہولناکی اور وحشت نے اسے دہشت زدہ کر دیا ہوگا، اپنے بچوں کے ساتھ بے پناہ شفقت و مہربانی رکھنے کے باوجود بھی ان سے بھاگے گا، جی ہاں! ایک دوسرے کے ساتھ میل ملاپ اور رحجان ختم ہو جائیں گے، باہم ربط و روابط ٹوٹ چکے ہوں گے اور رشتہ داریاں ختم ہو چکی ہوں گی، ان کے فرار کا سبب زیادہ ڈر اور خوف، قیامت کاشورش اور ہولناکی کے سوا کچھ نہیں، جیسا کہ حدیث مبارکہ میں آیا ہے: (تحشرون حفاة عراة مشاة غرلا، قال: فقالت زوجته: يا رسول الله، ننظر أو يري بعضنا عورة بعض؟ قال: لكل امرئ منهم يومئذ شأن يغنيه) ترجمہ: "قیامت کے دن لوگ اٹھائے جائیں گے ننگے پاؤں، ننگے بدن، بن ختنہ کئے ہوئے"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ نے پوچھا: اے اللہ کے رسول! کیا ہم ایک دوسرے کے ستر کو دیکھیں گے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہاں ہر ایک کی ایسی حالت ہوگی کہ اسے دوسرے سے بے پروا کرے گی اس دن ہر کوئی ایسے ڈر، خوف، اور پریشانی میں مبتلا ہوگا کہ کوئی بھی اس کام کی طرف دھیان نہیں دے گا۔

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ ۝ ہر شخص اس روز ایک فکر میں ہوگا، جو اسے بے پروا کر دے گا (۳۷)

اس دن ہر ایک کی مشکل صورتحال ہوگی جس نے اس کے دل کو مصروف اور عقل کو زائل کر دیا ہوگا، اس انداز سے کہ اپنے دوستوں کو بھول کر اپنے یاروں سے غافل ہوگا، اور اپنی رشتہ داریاں اور روابط چھوڑ کر خود میں مصروف ہوگا، قیامت کے دن قرابت داری ختم ہوگی اور دوسروں کی طرف دیکھنے کی فرصت نہیں ہوگی۔

علماء اور مفسرین نے لوگوں کے ایک دوسرے سے بھاگنے اور ڈر کی دلیل کے طور پر درج ذیل تشریح کی ہے:

1- ایک شخص کو یہ خوف لاحق ہوگا کہ اس کی نیکیاں نہ چھین لی جائیں، اس لیے ممکن ہے کہ دنیا میں کسی کا حق اس پر باقی ہو۔

2- ہر کوئی ذات میں مشغول ہوگا، اور اپنے بارے میں سوچتا ہوگا، حتیٰ کہ انبیاء اور سب کہیں گے: نفسی، نفسی۔

- 3- ہر کوئی دوسرے سے نیکی مانگے گا۔
 4- وہ بھاگے گا تاکہ دوسروں کے تقاضوں کا سامنا نہ کرنا پڑے، وہ بھاگے گا تاکہ دوسرے اس کو رسوا ہوتا ہوا نہ دیکھیں۔
 5- وہ بھاگے گا تاکہ اپنے کام مکمل کرے، اور اس کا فیصلہ جلد از جلد واضح ہو جائے۔

وَجُودُهُ يَوْمَئِذٍ مُّسْفِرَةٌ ۝۳۸	اور کتنے چہرے اس روز چمک رہے ہوں گے (۳۸)
--------------------------------------	--

"مُسْفِرَةٌ" "روشن اور چمکدار" ایسا چہرہ کہ دلی خوشی اس کی چمک سے عیاں ہوں، اس دن مؤمنوں کے چہرے ایسے ہوں گے، چمکتے دمکتے، خوشخبری ملنے پر یہ چمک ہوگی، خوشی حاصل ہونے پر اس کو یہ روشنی ملی ہوگی، سرور سے درخشاں، اس کو نور اور روشنی نے احاطہ کیا ہوگا۔

ضَاحِكَةٌ مُّسْتَبْشِرَةٌ ۝۳۹	خندان و شادان (یہ مؤمنانِ نیکوکار ہیں) (۳۹)
-------------------------------	---

یعنی وہ خدا کی نعمتوں اور کرم کو دیکھ کر بہت خوش اور سرور ہونگے اور ان دائمی اور ہمیشگی والی

نعمتوں کے حاصل ہونے پر خوشحال ہوں گے۔

"مُسْتَبْشِرَةٌ" اس خوشی کی خبر سننے کے بعد گال اور کھل جائیں گے، نہیں بھولنا چاہیے کہ: قیامت کے دن ہنسنا اور خوش ہونا یہ روشن مستقبل کی بشارت ملنے کی وجہ سے ہے، اس دنیا میں گناہوں سے آلودہ ہونا قیامت کے دن چہرے کو آلودہ کرنے کا سبب بنے گا۔

وَجُودُهُ يَوْمَئِذٍ عَلَيْهَا غَبَرَةٌ ۝۴۰	اور کتنے چہرے ہونگے جن پر گرد پڑ رہی ہوگی (۴۰)
---	--

یعنی: بہت سے چہرے اور بھی ہوں گے جو اداسی، ندامت، غم، پشیمانی، اور جرم کی دھول سے ڈھکے ہوئے ہوں گے، اور وہ لکڑیوں کی طرح آدھے جلے ہوئے، اس لیے کہ وہ دیکھ لیں گے کہ اللہ تعالیٰ نے سخت عذاب ان کے لیے تیار کیا ہے، رب کا عطا کیا ہوا انسانی چہرہ گناہ کی وجہ سے سیاہ ہو جاتا ہے اور بُرے نقاب سے ڈھانپ لیا جاتا ہے۔

"غَبَرَةٌ" اس پر غبار لگا ہوا ہوگا، رنجیدہ خاطر اور غمزدہ۔

تَرْبُّهَا قَتَرَةٌ ۝۴۱	(اور) سیاہی چڑھ رہی ہوگی (۴۱)
-------------------------	-------------------------------

یعنی: گناہوں کا اندھیرا، غلطیوں کی سیاہی اور معاصی کی تاریکیوں نے ان کے چہروں کو ڈھانپ لیا ہوگا، کیونکہ انہوں نے عذاب اور سزا دیکھی ہوگی۔ مفسر نسفی لکھتے ہیں: تو اس سے زیادہ خوفناک حالت نہیں دیکھو گے کہ ایک چہرہ میں غبار اور کالا پن اکٹھا ہو۔

یہ آیات قیامت کے دن لوگوں کو دو گروہوں میں تقسیم کرتی ہیں: (1) اہل سعادت، (2) اور اہل شقاوت: دو گروہ اپنی علامت اور چہروں سے پہچانے جائیں گے، چونکہ انسان کا چہرہ اس کی سیرت کا آئینہ ہے، اس کا اندرونی غم اور خوشی اس کے چہرے سے ظاہر ہوتی ہے، یہ سورت دنیا میں حق سے منہ پھرنے سے شروع ہوتی ہے، اور آخرت میں چہرہ دھوئیں سے آلودہ ہونے پر ختم ہوتی ہے۔

أُولَئِكَ هُمُ الْكَافِرَةُ الْفَجَرَةُ ﴿٤٢﴾ یہ کفار بدکردار ہیں (۴۲)

یہ وہی کفار ہیں جو دنیا میں کفر اور گناہوں میں زندگی گزارتے رہے، اور اسی حالت پر فوت ہوئے، یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے ایمان کو کفر کے پردے سے ڈھانپا ہے، اور اللہ کی کتاب اور اس کے پیغمبر کو جھٹلایا اور ایسے بدکار ہیں جو معصیت اور گناہوں کے مرتکب ہوئے ہیں، اور رسالت کا انکار کر کے گمراہی کا راستہ اپنائے ہوئے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جن کے ایمان مختلف بیماریوں جیسے نفاق اور ریا کے ساتھ خلط ملط ہوئے، اللہ کی اطاعت سے دور، واجبات کو چھوڑ کر ریا، زنا، اور خون ریزی جیسے محرمات کے مرتکب ہوئے۔

مفسر صاوی فرماتے ہیں: اللہ تعالیٰ نے ان کے چہروں پر سیاہی کے ساتھ ساتھ گرد و غبار کا بھی اضافہ کیا ہے، کیونکہ وہ لوگ کفر کے ساتھ فساد اور تباہ کاری کے بھی ذمہ دار ہیں۔

اس طرح اس سورت کی ابتداء اور انتہا ہم آہنگ ہے۔

سورہ کا آغاز معیار اور پیمانہ کی حقیقت بیان کرتا ہے، اور سورہ کا اختتام اس معیار، کسوٹی اور پیمانے کے نتیجہ پر بحث کرتی ہے، یہ مختصر سورت ان تمام عظیم حقائق، بڑے مناظر اور اہم امور کے بارے میں کانوں تک پیغام پہنچاتی ہے، اور ان تمام امور کو واضح اور عمدگی کے ساتھ بیان کرتی ہے۔

اس سورہ کے مخاطب کون ہے؟

سورہ عَبَسَ کے متعلق صحیح حدیث موجود ہے کہ اس سورہ کے مخاطب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

قاضی عیاض اور دوسرے علماء اہل سنت نے کہا ہے کہ یہ سورت کسی اور کے بارے میں نہیں بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نازل ہوئی ہے۔

امام ترمذی اور حاکم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کرتے ہیں: «أُنزِلَتْ: عَبَسَ وَتَوَلَّى» فِي ابْنِ أُمِّ مَكْتُومٍ الْأَعْمَى أَتَى رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَجَعَلَ يَقُولُ: يَا رَسُولَ اللَّهِ أُرْشِدْنِي، وَعِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَعَلِيٍّ آلِهِ وَسَلَّمَ رَجُلٌ مِنْ عِظَمَاءِ الْمُشْرِكِينَ، فَجَعَلَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَعَلِيٍّ آلِهِ وَسَلَّمَ يَعْزِضُ عَنْهُ، وَيَقْبَلُ عَلَيَّ الْآخِرَ. وَيَقُولُ: تَرَى بِمَا أَقُولُ بِأَسَا فِي هَذَا نَزَلَ. ترمذی (3331)۔

یعنی : ابن أم مکتوم نابینا نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا: اے رسول خدا! سیدھے راستے کے طرف میری راہنمائی کیجئے تاکہ میں کامیاب ہوجاؤں ، اسی دوران قریش کا ایک سردار آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا ، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن أم مکتوم سے منہ موڑا اس سردار کی طرف اپنا رخ کیا، اور کہا ، کیا آپ میری باتوں کی اہمیت وقوت سمجھ رہے ہو؟ اس غافل آدمی نے کہا؟ نہیں ، پھر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی۔

عصر حاضر کے محدث عبد الرزاق مہدی نے سیوطی کی کتاب "اسباب النزول" کی تحقیق میں کہا ہے: کہ یہ حدیث صحیح ہے ، اسے ترمذی 3331، ابن حبان 535، حاکم 2 / 514 اور واحدی نے 845 روایت کیا ہے ۔
حاکم کہتے ہیں کہ: یہ حدیث امام بخاری اور مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔
شیخ البانی بھی اس حدیث کو صحیح مانتے ہیں: صحیح الترمذی (3331)۔
ابویعلیٰ نے انس سے ایسی ہی روایت نقل کی ہے ، لیکن اس آدمی کا نام انہوں ابن خلف ذکر کیا ہے۔

طبری نے صفحہ 33624 پر قتادہ اور انس سے روایت کیا ہے کہ اس کی اسناد حسن ہے ، (مسند ابویعلیٰ 431/ 5 دارالمأمون للتراث دمشق)
عبدالرزاق "تفسیر قرآن" میں صفحہ 3494 پر قتادہ نے انس کو ذکر کئے بغیر روایت کیا ہے ، اس تفصیل کے ساتھ سابقہ حدیث کے لیے شاہد ہے ، تو متعلقہ صحیح حدیث کی بنا پر (جس کے دوسری شواہد بھی ہیں) معاملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عبداللہ بن أم مکتوم کے ساتھ سلوک اور رویہ سے متعلق ہے۔
یادر ہے کہ : ابن أم مکتوم کا عذر بھی یہی تھا کہ ان کو معلوم نہیں تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی اور کے ساتھ باتوں میں مصروف ہیں، اور اس امید کے ساتھ ان سے محو گفتگو ہیں کہ وہ مشرف بہ اسلام ہوجائے۔
ابن کثیر میں ایک روایت ہے: کہ حضرت عبد اللہ ابن أم مکتوم نابینا صحابی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے تقاضا کیا کہ قرآن مجید کی کوئی آیت اُسے سکھادیں ، اس سوال کے جواب کا فوری اصرار کر رہے تھے ، جبکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ کے سرداروں کو تبلیغ کرنے میں مصروف تھے جن میں : عتبہ بن ربیعہ ، ابوجہل بن ہشام اور حضرت عباس بن عبد المطلب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چاچا جو کہ اس وقت تک مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے شامل تھے۔

اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم عبد اللہ بن أم مکتوم کے جلدی جواب لینے پر اصرار سے ناراض ہو گئے ، کیونکہ عبد اللہ بن أم مکتوم پختہ مسلمان تھے اور ہمیشہ منظر میں موجود رہتے تھے ، کسی دوسرے وقت میں پوچھ سکتے تھے ، ان کو تاخیر سے جواب دینے میں کسی دینی خسارے اور نقصان کا ڈر نہیں تھا

، رؤسائے قریش کے برعکس کہ وہ دین سے دور تھے ، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کا دین کو ان تک پہنچا رہے تھے ، اور وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو سن رہے تھے ، اس لیے اس بات کا امکان تھا کہ وہ ایمان لاتے ، اگر ان سے گفتگو منقطع ہو جاتی تو ان کی دین سے محرومی واضح تھی۔

اس حالت کی بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن ام مکتوم کے سوال کا جواب دینے سے منہ موڑا اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا، اور کفار قریش کے ساتھ دعوتی گفتگو جاری رکھی۔

اس مجلس کے اختتام پر سورہ عبس کی یہ آیات نازل ہوئیں جن میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس طرح کے رویے میں بہتری لانے کی طرف توجہ دلائی گئی۔ کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال تھا کہ جو مسلمان آداب مجلس کا لحاظ نہیں رکھتا اسے کسی قدر تنبیہ کی ضرورت ہے ، تاکہ آئندہ مجلس کے آداب کا خیال رکھے ، اس بنا پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبد اللہ بن ام مکتوم سے منہ موڑا۔

دوسری وجہ یہ تھی کہ: ویسے تو کفر و شرک سب سے بڑے گناہ ہیں ، عبد اللہ بن ام مکتوم کو دین کے فروعی احکام کی تعلیم دینے پر انہیں مقدم کرنا افضل تھا۔

لیکن حق تعالیٰ جلہ شأنہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خیال کی تائید نہیں فرمائی، بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو متوجہ کر دیا کہ یہاں یہ بات اہم ہے کہ جو شخص آپ سے جواب مانگنے پر مصر ہے ، اس کے سوال کا جواب دینے کا فائدہ یقینی ہے ۔

جبکہ آپ کی گفتگو ایسے آدمی کے ساتھ کہ جو آپ سے بات کرنا نہیں چاہتا تو یہ ایک موہوم اور غیر یقینی بات ہے ، ایک غیر یقینی امر کو یقینی امر پر ترجیح نہیں دینی چاہیے ، عبد اللہ بن ام مکتوم نے جو مجلس کے آداب کے خلاف عمل کیا تھا اس کا عذر قرآن کریم نے لفظ "اعمی" کے ساتھ بیان فرمایا کہ وہ نا بینا تھے ، جس کی وجہ سے دیکھ نہیں سکتے تھے ، کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس کام میں مصروف ہیں ، اور رکن لوگوں سے گفتگو فرما رہے ہیں ، اس لیے وہ معذور تھے نظر انداز کرنے کے مستحق نہیں تھے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اگر کوئی معذور آدمی مجلس کے آداب کے برخلاف کوئی کام کرے تو وہ ملامت و مذمت کا مستحق نہیں ہے ۔

(عَبَسَ وَتَوَلَّى) "عَبَسَ" بہ معنی تیوری چڑھا نا ، یعنی چہرے پر ناگواری کا ظاہر ہونا ، و "وَتَوَلَّى" بہ معنی منہ موڑنے کے ہے۔

یہاں حاضر کے صیغے سے مخاطب کرنے کا موقع تھا، لیکن یہ قرآن کریم کا اعجاز ہے کہ صیغہ حاضر کی جگہ غائب استعمال ہوا، کہ سرزنش کے موقع پر بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام کا لحاظ رکھا گیا۔

یا اس طرح کہ غائب کا صیغہ استعمال کرنے سے یہ ابہام باقی رہا کہ گویا یہ کسی دوسرے شخص نے کیا ہے، اور اس طرف اشارہ کر دیا کہ ایسا رویہ آپ کے شایان شان نہیں تھا، اور دوسرے جملے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے عذر کی طرف متوجہ کر دیا:

(ومایدریک) آپ کو کیا معلوم تھا؟ یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اعراض کی وجہ بیان فرمائی کہ آپ کو معلوم نہیں تھا، کہ جو کچھ یہ صحابی سیکھیں گے اس کا اثر یقینی ہے، اور دوسروں کے ساتھ کی جانی والی گفتگو کا اثر موہوم اور غیر یقینی ہے۔

نیز بعد والے جملے میں غائب کا صیغہ چھوڑ کر مخاطب کا صیغہ استعمال کیا، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکریم اور تسلی کے لیے ہے، اگر خطاب کے صیغے میں لفظ "کلا" کا استعمال نہیں ہوتا تو یہ شبہ باقی رہتا کہ اس رویہ کی ناپسندیدگی کی وجہ سے مخاطب قرار نہیں دیئے گئے، تو یہ معاملہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تکلیف دہ ہوتا۔

تو اس بنا پر جیسے پہلے جملے میں غائب کے صیغے لانے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکریم کو ملحوظ خاطر رکھا گیا، بالکل اسی طرح بعد والے جملے میں بھی صیغہ خطاب کا لانا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی اور تکریم و احترام کے واسطے ہے۔

(أَلَعَلَّ يُزَكِّي، أَوْ يَذْكُرُ فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرُ) یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو کیا معلوم تھا کہ یہ صحابی جو کچھ حاصل کریگا اس کا فائدہ یقینی ہے، چنانچہ اسے تعلیم دینی چاہیے تاکہ اس سے وہ اپنے نفس کا تزکیہ کرے، اور کمال حاصل کرے، اگر یہ نہ ہوتا تو کم از کم اللہ تعالیٰ کے ذکر کے ابتدائی فوائد سے مستفید ہوتا، اور پھر اس کے اثر سے اس کے قلب میں محبت اور خدا تعالیٰ کا خوف زیادہ ہوتا۔

لفظ "ذکری" بہ معنی کثرت ذکر کے ہے، قرآن کریم نے یہاں دو جملے ذکر کیے: "يُزَكِّي" اور "يَذْكُرُ" پہلے کا معنی پاک اور صاف ہونے کا ہے، اور دوسرے کا معنی نصیحت حاصل کرنے اور نصیحت سے متاثر ہونے کا ہے۔

پہلا اتقیاء اور نیک لوگوں کا مقام ہے، کہ اپنے نفس کو ہر قسم کے ظاہری اور باطنی ناپاکی سے پاک و صاف رکھتے ہیں، ورنہ دوسرا مقام ابتدائی سالک کا ہے، جو کہ اس راستے پر پہلی بار چل پڑا ہے، مبتدی بن کر، اسے اللہ

تعالیٰ کا ذکر سکھایا جاتا ہے، تاکہ اس سے خدا کی عظمت اور خوف اس کے دل میں پیدا ہو جائے۔

مطلب یہ ہے کہ اس کی تعلیم یا اسے سکھا نا کسی بھی حالت میں فائدہ سے خالی نہیں تھا، چاہے وہ کامل نفع ہو، جس سے نفس کا مکمل تزکیہ ہوتا ہے، یا ابتدائی نفع کہ اللہ تعالیٰ کی یاد، ذکر اور خوف اس کے دل میں بڑھ جاتا، دونوں جملوں کے درمیان لفظ تردیدی "او" آیا ہے، تا کہ ان دونوں حالتوں میں سے کوئی ایک حالت حاصل ہو جائے، یہاں "مانعة الخلو" کی صورت ہے، یعنی یہ احتمال بھی ہے کہ دونوں منافع ایک ساتھ حاصل ہوں، کہ ابتداء میں نصیحت اور تذکیر حاصل ہو، اور آخر میں تزکیہ نفس میسر آجائے، "مانعة الجمع" نہیں ہے کہ دونوں ایک ساتھ جمع نہ ہوں۔ "مظہری"

انبیاء کا معصوم ہونا

اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبر دین اور شریعت کی تبلیغ میں معصوم ہیں: اس کا معنی یہ ہے کہ: جو کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آجائے اس میں کمی بیشی کے بغیر لوگوں تک پہنچا دیتے ہیں: اللہ تعالیٰ اپنے نبی کے بارے میں سورۃ الحاقہ میں فرماتا ہے: وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقَاوِيلِ * لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ * ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ * فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ * وَإِنَّهُ لَتَذَكَّرَةٌ لِلْمُتَّقِينَ (سورہ الحاقہ 44-48)۔

یعنی اگر ہم پر جھوٹ باندھتا، تو ہم اسے سختی سے پکڑتے اور ہم اس کے دل کی رگ کاٹ دیتے، اور تم میں سے کوئی بھی اس کو سزا دینے سے نہیں بچا سکتا تھا، اور یہ یقیناً پرہیزگاروں کے لیے نصیحت ہے۔

رب تعالیٰ نے اپنے پیارے نبی علیہ السلام سے فرمایا: يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ (سورہ مائدہ 67)

اے پیغمبر! جو کچھ تیرے رب کی طرف سے تجھ پر نازل ہوا اس کی تبلیغ کر، اگر ایسا نہیں کیا تو تم نے اس کا پیغام نہیں پہنچایا، اور اللہ تعالیٰ تجھے لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

اس بنا پر یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ کے بھیجے ہوئے انبیاء دین اور شریعت میں سے کوئی چیز بھول جائیں اور لوگوں تک نہ پہنچائیں، یا اسے بدل دیں یا چھپا دیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دین کو مکمل طور پر لوگوں تک پہنچا دیا اور ان کے سامنے پیش کر دیا۔

اللہ تعالیٰ نے حجة الوداع کے موقع پر یہ آیت مبارکہ نازل فرمائی: (الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتِمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا) (سورۃ المائدہ آیت: 4) ترجمہ: آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا، اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی، اور اسلام بطور دین کے تمہارے لیے پسند کیا۔

نیز اللہ تعالیٰ کے تمام پیغمبر کبائر کے ارتکاب سے معصوم تھے، جیسا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے کھاہے: عالم اسلام کے اکثر علماء اور تمام فرقے کہتے ہیں کہ: انبیاء علیہم السلام کبائر کے ارتکاب سے (نہ کہ صغائر) معصوم تھے، اور اہل تفسیر وحديث اور فقہاء کا بھی یہی کھاہے، بلکہ اس بات کا ذکر کہیں نہیں ملتا کہ سلف امت او رائمہ دین، صحابہ کرام اور تابعین وتبع تابعین میں سے کسی نے اس کے خلاف کوئی بات کی ہو (مجموع الفتاوی جلد : 319/4).

تنبیہ

بعض دفعہ ایسا بھی ہوا کہ انبیاء کرام سے بعض دینی کاموں یا دین اور شریعت سے متعلق امور میں معمولی سی فروگزاشت ہوئیں، مگر فی الفور ان کی اصلاح وحی الہی کے ذریعے کی گئی، تاکہ ایسا نہ ہو کہ رسالت کا کام مشکوک ہو جائے، اس طرح درپیش نقصان کی تلافی کرنا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھایا جاتا، تاکہ آپ کے ساتھی بھی سیکھ جائیں کہ جب بھی کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اس کا ازالہ کیسے کیا جائے؟

بالفاظ دیگر: غلطیوں کا سرزد ہوجانا لوگوں کو دین کی تعلیم سے آراستہ کرنے کا ایک طریقہ تھا۔

مثال کے طور پر: ایک روایت میں مذکور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے چار رکعت والی نماز میں سہوًا دو رکعت پڑھا کر سلام پھیر دیا، پھر جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی توجہ اس طرف دلائی گئی تو فی الفور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا ازالہ کر کے سجدہ سہو کیا، لوگوں نے جب یہ منظر دیکھا تو وہ سیکھ گئے کہ آئندہ جب کبھی نماز میں سہو ہو جائے تو (نماز دوہرائے بغیر) کیسے اس کا ازالہ کیا جائے، تو اس طرح سہو واقع ہونے کی حکمت لوگوں کو دین سکھانا ہے، اب ہم ایسے واقعات اور روایات کی موجودگی کی وجہ سے جانتے ہیں کہ سہو ہو جائے تو کیا کرنا چاہیے، اگر یہ روایات اور واقعات نہ ہوتے تو ہم اس کے ازالے کو نہیں سمجھ پاتے۔

ایک اور مثال بدر کے قیدیوں کا واقعہ ہے، امام احمد وغیرہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مخاطب کر کے فرمایا: خدا نے ان کو آپ لوگوں کے طاقتور پنجے میں دیدیا ہے، آپ لوگوں کی ان قیدیوں کے بارے میں کیا رائے ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے ہو گئے اور کھا: ان سب کی گردنیں اڑادیں، پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منہ پھیرا، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اٹھے اور کھنے لگے: میری رائے یہ ہے کہ ان کو معاف کیا جائے (ان کو قتل کرنے سے صرف نظر کیا جائے) اور ان سے فدیہ وصول کیا جائے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فدیہ کے بدلے ان کو

معاف کر دیا، اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے آیت نازل فرمائی : "مَا كَانَ لِإِنبِيٍّ أَنْ يَكُونَ لَهُ أَسْرَى حَتَّى يُتْخَنَ فِي الْأَرْضِ تُرِيدُونَ عَرَصَ الدُّنْيَا وَاللَّهُ يُرِيدُ الْآخِرَةَ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ * لَوْلَا كِتَابٌ مِّنَ اللَّهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيمَا أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ " (احمد : 13143) ترجمہ: "کسی پیغمبر کیلئے جائز نہیں ہے کہ اس کے پاس قیدی ہوں اور وہ ان کا خون نہ بہائے، تم دنیا کا فائدہ چاہتے ہو، حالانکہ اللہ تعالیٰ (تمہارے لیے) آخرت کا فائدہ چاہتا ہے، اور اللہ تعالیٰ غالب حکمت والا ہے، اگر رب تعالیٰ کی طرف سے صادر شدہ فیصلہ پہلے سے موجود نہ ہوتا تو اس فدیہ کے بدلے جو تم نے حاصل کیا تمہیں ایک بڑا عذاب گھیر لیتا"

اس موقع پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اجتہاد سے فدیہ کے بدلے قیدیوں کو آزاد کرنے کا حکم فرمایا، لیکن اس اجتہاد کی وحی کے ذریعہ تائید نہیں ہوئی، اور لوگ سمجھ گئے کہ شارع کا مقصود کیا ہے، اس بنا پر پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اپنی رسالت اور دین کے ابلاغ میں معصوم تھے۔ اگر کبھی عبادت کے معاملے میں ان سے کوئی سہو یا غلطی ہو جاتی، اگر کوئی اجتہادی سہو دینی احکام سے متعلق صادر ہو جاتی تو فوری طور پر وحی کے ذریعہ ان کی اس سہو کی تصحیح کی جاتی، اور لوگوں تک پہنچادی جاتی، اور لوگ دین کے مسائل اس سے سیکھتے۔

لیکن بعض اوقات ان سے دنیا کے معاملات اور کار بار میں بھی غلطیاں ہو جاتی تھیں، البتہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کے لیے رسالت کے امور اور دنیاوی امور میں فرق کرنا آسان تھا، اگرچہ دینی امور کی پہچان اور فرق کرنا دنیاوی امور سے ہر انسان کا کام نہیں ہے، اس لیے کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام آپ سے سوال کرتے تھے کہ فلاں کام یا امر وحی ہے، یا آپ کی ذاتی رائے؟

جیسا کہ ایک صحیح حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کے لشکر کو حکم دیا کہ مشرکوں سے پہلے بدر کے پانیوں پر پہنچ جائیں، اور انہیں وادی بدر کے پانی کے ذخائر تک نہ پہنچنے دیں، انہوں نے رات کے ایک حصے میں وادی بدر کے قریب ترین پانی کے کنویں پہنچ کر پڑاؤ ڈالا۔

حُباب نے ایک عسکری تجربہ کار اور ماہر کی حیثیت سے کہا : (أرأيت هذا المنزل أمّنزلًا أنزله الله ليس لنا أن نتقدمه ولا نتأخره أم هو الرأي والحرب والمكيدة؟ قال بل هو الرأي والحرب والمكيدة قال يا رسول الله فإن هذا ليس لك بمنزل امض بالناس حتي تأتي أدني ماء من القوم فنعسكر فيه ثم نغور ما وراءه من الآبار ثم نبنى عليه حوضاً فنملؤه ماء ثم نقاتل القوم فنشرب ولا يشربون فقال رسول الله صلي الله عليه وسلم لقد أشرت بالرأي ثم أمر بإنفاذه فلم يجيء الليل حتي تحولوا كما رأي الحباب وامتلكوا مواقع الماء» (فقه السيرة) و (دلائل النبوة)

البانی نے اسے صحیح قرار دیا ہے) ترجمہ: "اے اللہ کے رسول! اس مقام پر جو ہم ٹھہرے ہیں، کیا اس مقام پر رکنا اللہ تعالیٰ نے (وحی کے ذریعے) ہمارے لیے متعین کیا ہے کہ ہم اس سے آگے جانے کا حق نہیں رکھتے اور نہ اس سے پیچھے جاسکتے ہیں، یا یہ رأی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی جنگی حکمت عملی ہے؟ فرمایا: "بل هو الرأي والحرب والمكيدة" نہیں، بلکہ یہ میری رائے اور جنگی حکمت عملی ہے، حُباب بن منذر نے کہا: اے اللہ کے رسول! یہ ٹھہرنے کی جگہ نہیں ہے، بلکہ لشکر کو حرکت دیں مخالف جماعت کی طرف تا کہ قریب ترین کنویں کے پانی تک پہنچ جائیں، وہاں ٹھہرجائیں، اور اس طرف کے کنوؤں کو کھود کر (حوض) تالاب بنائیں، اور اس میں پانی بھریں، تب مخالفین سے جنگ کریں کہ ہمارے پاس پانی ہو اور ان کے پاس نہ ہو"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "لقد أشرت بالرأي" تم نے بہترین رائے پیش کی ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لشکر کو چلنے کا حکم فرمایا، : جاکر دشمن کے قریب ترین کنویں تک پہنچ گئے، اور آدھی رات کو وہاں جابسے، راتوں رات پانی کے تالاب بنائے اور وہاں کے تمام پانی کے کنوؤں کو کھود کر ان کا پانی اُن تالابوں میں بھر دیا۔

اس معاملے میں ہم دیکھتے ہیں کہ جب حُباب بن منذر پر مسئلہ مشتبہ ہو گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل وحی ہے یا ذاتی رائے ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تاکہ مسئلہ واضح ہو جائے۔

ایک دوسری صحیح روایت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ایک دن چند آدمیوں کے پاس سے گذر رہے تھے اور وہ لوگ اپنے کھجوروں کی تلقیح (نرکھجور کے پھول مادے میں ملانا) کر رہے تھے، تو آپ علیہ السلام نے فرمایا: "لَوْ لَمْ تَفْعَلُوا لَصَلَحَ" اگر تم لوگ اس طرح کھجوروں کے نر اور مادے کو ملانے والا عمل نہ کرو تو بہتر ہوگا، تونبی علیہ السلام کے کھنے پر انہوں نے ایسا کرنا چھوڑ دیا، لیکن اس کے بعد کھجوروں کی پیداوار اچھی نہیں ہوئی۔

کچھ مدت کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم دوبارہ ان کے پاس گئے ان سے پوچھا کہ: "مَا لِنَخْلِكُكُمْ؟" کھجور کیسے پھل دے رہے ہیں؟ انہوں نے کھجوروں کے کم پھل دینے کی شکایت کی، تو آپ نے فرمایا کہ: "أَنْتُمْ أَعْلَمُ بِأَمْرِ دُنْيَاكُمْ" آپ لوگ اپنے دنیاوی امور کو بہتر جانتے ہو۔

مسند بزار میں آیا ہے کہ فرمایا: «وَإِنِّي قُلْتُ لَكُمْ ظَنًّا ظَنَنْتُهُ، فَمَا قُلْتُ لَكُمْ قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ فَلَنْ أَكْذِبَ عَلَى اللَّهِ تَبَارَكَ وَتَعَالَى» یعنی: جومیں نے آپ لوگوں سے کہا یہ میری اپنی ذاتی رائے تھی، لیکن جب میں آپ لوگوں سے کھدوں

کہ اللہ رب العزت نے فرمایا ، وہ کبھی بھی رب تعالیٰ پر جھوٹ نہیں ہوگا۔
(صحیح مسلم (2363) و مسند البزار (937)۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا گیا ہے کہ : «إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ إِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِّنْ دِينِكُمْ فَخُذُوا بِهِ، وَإِذَا أَمَرْتُكُمْ بِشَيْءٍ مِّنْ رَّأْيِي، فَإِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ»۔
صحیح الجامع (2338)۔

ترجمہ: بیشک میں بشر ہوں (تمہارے جیسے) میں تمہیں دین کے معاملے میں کوئی حکم کر دوں تو فوراً بجالاؤ، اور اگر اپنی ذاتی رائے سے کچھ کہوں تو تم سمجھو اس میں بشریت کے لحاظ سے غلطی کا احتمال ہے ۔

خلاصہ یہ ہے کہ :

انبیاء علیہم السلام دین کی تبلیغ میں معصوم عن الخطأ تھے، اور انہوں نے دین سے متعلق تمام احکام کمی بیشی اور کسی قسم کی غلطی کے بغیر لوگوں تک پہنچادیئے ہیں ، اگر کبھی دین سے متعلق کسی مسئلہ میں ان سے سہو ہو جاتی تو فوری طور پر وحی کے ذریعے سے ان کی اصلاح کرا دی جاتی، اور لوگ اس سے باخبر ہو جاتے ، دین کے علاوہ دنیاوی معاملات میں معصوم نہیں تھے، اور اس سے ان کی رسالت میں کوئی نقصان بھی نہیں پہنچتا، کیونکہ رب تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ تمہارے لیے ایسا پیغمبر بھیجا ہے جو تاجر اور طبیب یا کسی صنعت سے وابستہ ہے ۔

اس لیے کہ ان امور میں غلطی کرنا کوئی تعجب کی بات نہیں ، اور امور رسالت کے معاملات کی پہچان لوگوں کے لیے آسان تھی، جیسا کہ ہم نے چند مثالیں بیان کر دیں کہ دینی مسائل اور دنیاوی مسائل میں فرق کرنا آسان تھا اور دین سے متعلق تمام مسائل کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دین کے عنوان سے لوگوں کو سمجھا تے تھے تا کہ لوگوں کو معلوم ہو کہ فلاں مسئلہ دین کا ہے، اور فلاں مسئلہ (دنیاوی امور سے متعلق ہے) رسالت کے امور میں سے نہیں ہے۔ اس بنا پر فقہائے اسلام نے کہا ہے: کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال میں اصول یہ ہے کہ آپ کا قول شریعت کی قانونی بنیاد ہے، اور وحی کا حصہ ہے ۔

البتہ اگر ایسی کوئی دلیل ہو جو ثابت کرے کہ آپ کا فلاں قول آپ کی ذاتی رائے ہے تو الگ بات ہے، اور اگر ایسی کوئی دلیل میسر نہ ہو تو اصل پر عمل کیا جائے گا، یعنی آپ کے اقوال وحی کے تائید کنندہ ہوں گے، اور وہ شرعی حکم ہوں گے ۔

جبکہ نبوی افعال میں اصول یہ ہے کہ ہمیشہ شرعی حکم نہیں ہوتا، کبھی قانونی ہوتا ہے ، اور کبھی اجتہادی اور کبھی ذاتی رائے ۔

انبیاء علیہم السلام کن امور میں معصوم ہیں؟

انبیاء علیہم السلام مخلوقات میں سب سے اشرف اور پاک تھے، سب سے زیادہ تقویٰ والے تھے، رب تعالیٰ سے ڈرنے والے اور وہ منتخب جماعت ہیں جن کی طرف لوگوں کو دیکھنا چاہیے اور ان کی اقتدا کرنی چاہیے۔
خدا کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کو خطاؤں اور گناہوں سے عصمت اور حفاظت کا درجہ حاصل ہے، ہم عصمت سے متعلق مسائل کو درج ذیل دو امور میں تقسیم کرتے ہیں۔

1- دین کی تبلیغ میں عصمت

2- بحیث بشر کے غلطیوں سے پاک ہونا

پہلا امر یعنی: تبلیغ دین میں تمام انبیاء معصوم ہیں، رب تعالیٰ فرماتے ہیں: "وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْأَقْوَالِ * لَأَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِينِ * ثُمَّ لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِينَ * فَمَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ عَنْهُ حَاجِزِينَ * وَإِنَّهُ لَتَذِكْرَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ" (سورہ الحاقہ 44-48)۔

ترجمہ: اگر یہ پیغمبر ہماری نسبت کوئی بات جھوٹ بنالائے، تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے، پھر اُن کی رگ گردن کاٹ ڈالتے، پھر تم میں سے کوئی (ہمیں) اس سے روکنے والا نہ ہوتا، اور یہ (کتاب) تو پرہیزگاروں کے لئے نصیحت ہے۔

اور اپنے پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا: "يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ" (سورہ مائدہ 67)۔

ترجمہ: اے پیغمبر جو ارشادات خدا کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں سب لوگوں کو پہنچادو، اور اگر ایسا نہ کیا تو تم خدا کے پیغام پہنچانے میں قاصر رہے، (یعنی پیغمبری کا فرض ادا نہ کیا) اور خدا تم کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔

شیخ عبد العزیز بن باز رحمہ اللہ (فتاویٰ ابن باز میں: ج 371/6) فرماتے ہیں: تمام مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ تمام انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام دین کی تبلیغ میں غلطیوں سے معصوم ہیں، جیسا کہ جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں رب تعالیٰ فرماتے ہیں: (والنجم إذا هوي * ما ضل صاحبكم وما غوي * وما ينطق عن الهوي * إن هو إلا وحي يوحى * علمہ شدید القوي) (سورہ النجم 1-5) **ترجمہ:** تارے کی قسم جب غائب ہونے لگے، کہ تمہارے رفیق (محمد) نہ رستہ بھولے ہیں نہ بھٹکے ہیں، اور نہ خواہش نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں، یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے جو (انکی طرف) بھیجا جاتا ہے، انکو نہایت قوت والے نے سکھایا (یعنی جبرائیل)۔

ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تبلیغ دین سے متعلق تمام امور قول، فعل اور تقریر میں معصوم ہیں، اس مسئلہ میں اہل علم کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔

دوسرا امر: یعنی بشری اور انسانی غلطیوں سے پاک ہونا، یہ مسئلہ دو حصوں میں تقسیم ہوتا ہے:

- 1- کبیرہ گناہوں سے متعلق انبیاء علیہم السلام کی عصمت، کہ تمام انبیاء علیہم السلام کبائر کے ارتکاب سے معصوم ہیں، جیسا کہ شیخ السلام ابن تیمیہ رحمہ اللہ (مجموع الفتاوی: ج-4/319) میں اس پر تاکید فرماتے ہیں۔
- 2- صغیرہ گناہ، بعض اوقات انبیاء علیہم السلام میں سے بعض صغائر کے مرتکب ہوئے ہیں، اس لیے اکثر اہل علم معتقد ہیں کہ انبیاء علیہم السلام صغائر سے معصوم نہیں ہیں۔

اگر انبیاء میں سے کسی نے صغیرہ گناہ کیا ہے تو اللہ تعالیٰ نے اسے تنبیہ کی ہے اور اس نے توبہ کے لیے پھل کی ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام نے گناہ کیا اور شیطان نے اسے بھکایا، دلیل کے طور پر رب تعالیٰ کی نازل کی ہوئی اس آیت کو پیش کرتے ہیں: "فَأَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْآتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَرَقِ الْجَنَّةِ وَعَصَى آدَمُ رَبَّهُ فَغَوَى" (سورہ طہ 121)۔ ترجمہ: تو دونوں نے اُس درخت کا پھل کھالیا تو ان پر انکی شرمگاہیں ظاہر ہو گئیں، اور وہ اپنے (بدنوں) پر بھشت کے پتے چپکانے لگے، اور آدم نے اپنے پروردگار کے حکم کے خلاف کیا تو (وہ اپنے مطلوب سے) بے راہ ہو گئے۔

اور سورہ بقرہ آیت (36) میں فرماتے ہیں: "فَأَزَلَّهُمَا الشَّيْطَانُ عَنْهَا" ترجمہ: پھر شیطان نے دونوں کو وہاں سے پھسلا دیا۔

مگر ان لوگوں کی بات غلط ہے اس لیے: کہ یہاں پر آدم علیہ السلام سے متعلق جو کچھ بیان ہوا ہے وہ نبوت سے پہلے ہے، اس کی بنیاد پر آدم علیہ السلام کو طعن کرنا درست نہیں ہے، امام ابوبکر بن فورک کہتے ہیں: یہ معاملہ نبوت سے پہلے کا ہے، اس کی دلیل رب تعالیٰ کا یہ فرمان ہے: "ثُمَّ اجْتَبَاهُ رَبُّهُ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدَى" (سورہ طہ 122) ترجمہ: پھر رب تعالیٰ نے اسے برگزیدہ کیا اور اس کی توبہ قبول فرما کر اسے ہدایت بخشی۔

کہتے ہیں کہ اسے منتخب کرنا اور ہدایت دینا گناہ ونا فرمانی کے بعد کا ہے، اگر نبوت سے پہلے کا ہو تو یہ اس اکیلے کی لغزش ہے، اور نبوت سے پہلے انبیاء کیلے کوئی شریعت نہیں ہوتی کہ ہم پر اس کی تصدیق کرنا واجب ہو۔

لیکن جب رب تعالیٰ نے اسے لوگوں کی طرف مبعوث فرمایا تو پھر دین کے پہنچانے میں امانتدار اور معصوم ہیں، اور سابقہ گناہ سے ان کو نقصان نہیں پہنچتا۔

اگر یہ کھاجائے کہ رونما ہونے والے ان واقعات کا کس طرح آدم علیہ السلام کے قبل نبوت سے ربط دیتے ہو، کیا نبوت رب تعالیٰ کی طرف سے وحی کو نہیں کہتے؟

جب کہ آیات واحادیث یہ بیان کرتی ہیں کہ رب تعالیٰ آدم علیہ السلام کے ساتھ جنت سے نکلنے سے پہلے بھی بات کرچکے ہیں۔

جواب یہ ہے کہ: یہاں نبوت منتفی ہے، اس لیے کہ نبوت صرف وحی نہیں ہے، بلکہ کسی نبی اور پیغمبر کیلئے جدید شریعت کا بھیجنا یا پہلے والے شریعت کی تجدید ہے۔

اور یہ دلائل آدم علیہ السلام کے متعلق نہیں ملتے ہیں کہ جنت میں اپنی بیوی کے ساتھ انہیں شریعت دی گئی ہو۔

اس وجہ سے سب سے صحیح بات آدم علیہ السلام کے ساتھ رونما ہونے والے واقعات میں یہ ہے کہ یہ نبوت اور ان کے مبعوث ہونے سے پہلے تھا۔

صرف وہی چیز جو آدم علیہ السلام کے لیے شریعت کو ممکن بناتی ہے وہ ہے توبہ جو انہوں نے نافرمانی کے بعد کی تھی۔

البتہ یہ توبہ بھی شریعت ہونے کی وجہ سے نہیں، بلکہ روح کی پاکیزگی اور آدم علیہ السلام کی طرف سے خالق کے مقام و مرتبہ کے پہچان کی وجہ سے ہوا، رب تعالیٰ فرماتے ہیں: "فَتَلَقَّى آدَمُ مِنْ رَبِّهِ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ إِنَّهُ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ" (سورہ بقرہ 37)

ترجمہ: پھر آدم نے اپنے پروردگار سے کچھ کلمات سیکھے (اور معافی مانگی) تو اس نے قصور معاف کر دیا بیشک وہ معاف کرنیوالا (اور) صاحب رحم ہے۔

ان مثالوں میں سے جن کو مخالفین اس بارے میں بیان کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس کے ذریعے سے قرآن کریم پر اعتراض کریں، ایک مثال اس واقعے کی ہے جو نبوت سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کے متعلق رونما ہوا، اور وہ قتل کا ارتکاب ہے، اور اس کے لیے قرآن سے دلیل لاتے ہیں: وَدَخَلَ الْمَدِينَةَ عَلَى حِينٍ غَفْلَةٍ مِّنْ أٰهْلِهَا فَوَجَدَ فِيْهَا رَجُلَيْنِ يَقْتَتِلَانِ ۖ هٰذَا مِنْ شِيعَةِ مُوْسٰى وَهٰذَا مِنْ عَدُوِّهِ ۚ فَاسْتَنَاعَهُ الَّذِيْ مِنْ شِيعَتِهِ عَلٰى الَّذِيْ مِنْ عَدُوِّهِ ۚ فَوَكَرَهُ مُوْسٰى فَقَضٰى عَلَيْهِ ۚ قَالَ هٰذَا مِنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّهُ عَدُوٌّ مُّضِلٌّ مُّبِينٌ ۝۱۵ (سورہ قصص)۔

ترجمہ: شہر کے لوگ بے خبر تھے کہ موسیٰ علیہ السلام شہر میں داخل ہوئے، اور دیکھا کہ دو شخص آپس میں لڑ رہے ہیں، ان میں سے ایک موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے تعلق رکھتا تھا اور دوسرا دشمن کی قوم سے تھا، تو پھر جو شخص موسیٰ علیہ السلام کی قوم سے تھا وہ مدد کیلئے پکارا، موسیٰ علیہ

السلام اس کی مدد کیلئے دوڑے اور ایک مُگے سے اس کا کام تمام کر دیا ، اور کھا یہ کام شیطان کے بھکاوے سے ہوا ، یقیناً شیطان گمراہ کرنے والا اور کھلا دشمن ہے ، اس کے بعد کہتے ہیں کہ: موسیٰ علیہ السلام اس غلطی کے ارتکاب سے کافی پشیمان ہوئے ، یہی ندامت سبب بنی کہ اپنے پروردگار کے حضور قیامت میں شفاعت کرنے سے پیچھے رہیں گے ، جیسا کہ شفاعت والی طویل حدیث میں بیان ہوا ہے: "فَيَأْتُونَ مُوسَىٰ فَيَقُولُونَ يَا مُوسَىٰ أَنْتَ رَسُولُ اللَّهِ فَضَلَّكَ اللَّهُ بِرِسَالَتِهِ وَبِكَلَامِهِ عَلَى النَّاسِ اشْفَعْ لَنَا إِلَىٰ رَبِّكَ أَلَا تَرَىٰ إِلَيَّ مَا نَحْنُ فِيهِ فَيَقُولُ إِنَّ رَبِّي قَدْ غَضِبَ الْيَوْمَ غَضَبًا لَمْ يَغْضَبْ قَبْلَهُ مِثْلَهُ وَلَنْ يَغْضَبَ بَعْدَهُ مِثْلَهُ وَإِنِّي قَدْ قَتَلْتُ نَفْسًا لَمْ أَوْمَرْ بِقَتْلِهَا نَفْسِي نَفْسِي" (بخاری)

ترجمہ: قیامت کے دن لوگ موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور کہیں گے: اے موسیٰ! آپ تو اللہ کے رسول ہو، رب تعالیٰ نے آپ کو رسالت دے کر اور آپ سے ہم کلام ہو کر آپ کو فضیلت دی ہے، اپنے پروردگار سے ہماری شفاعت کریں ، آپ ہمیں نہیں دیکھتے کہ ہم کس حالت میں ہیں، موسیٰ علیہ السلام جواب میں کہیں گے: میرا رب آج اتنے غصے میں ہے کہ نہ پہلے کبھی تھا اور نہ آئندہ اتنا غصہ ہوگا، میں نے ایک شخص کو بغیر کسی حکم کے قتل کر دیا تھا، اس لیے مجھے اپنی فکر لگی ہے ۔

اس بارے میں بھی امام ابوبکر بن فورک کہتے ہیں کہ : جو کچھ مخالفین موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بیان کرتے ہیں وہ بھی نبوت سے پہلے کا واقعہ ہے ، جیسا کہ خدا تعالیٰ فرماتے ہیں: «قَالَ أَلَمْ نُرَبِّكَ فِينَا وَلِيدًا وَلَبِثْتَ فِينَا مِنْ عُمُرِكَ سِنِينَ* وَفَعَلْتَ فَعَلْتِكَ الَّتِي فَعَلْتَ وَأَنْتَ مِنَ الْكَافِرِينَ* قَالَ فَعَلْتُهَا إِذَا وَأَنَا مِنَ الضَّالِّينَ* فَفَرَرْتُ مِنْكُمْ لَمَّا خِفْتُكُمْ فَوَهَبَ لِي رَبِّي حُكْمًا وَجَعَلَنِي مِنَ الْمُرْسَلِينَ» (سورہ شعرا 18-21) .

(فرعون نے موسیٰ سے کہا) کیا ہم نے تم کو کہ ابھی بچے تھے پرورش نہیں کی اور تم نے برسوں ہمارے ہاں عمر بسر (نہیں) کی، اور تم نے وہ کام کیا تھا جو کیا اور تم ناشکرے معلوم ہوتے ہو، (موسیٰ نے) کھاکہ (ہاں) وہ حرکت مجھ سے ناگہاں سرزد ہوئی تھی اور میں خطاکاروں میں تھا، تو جب مجھے تم سے ڈر لگا تو میں تم سے بھاگ گیا، پھر خدانے مجھے نبوت و علم بخشا اور مجھے پیغمبروں میں سے کیا۔

موسیٰ علیہ السلام اسے قتل کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے تھے، بلکہ اپنے قومی بھائی کا دفاع کرنا چاہتے تھے، اس بنا پر وہ قتل عمد کے مرتکب نہیں ہوئے، اس کام کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام نے رب تعالیٰ سے بخشش طلب کی، اور خدا نے بھی انہیں بخش دیا، جیسا کہ فرماتے ہیں: قَالَ رَبِّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي فَاغْفِرْ لِي فَغَفَرَ لَهُ إِنَّهُ هُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (سورہ قصص 16)

ترجمہ: بولے کہ اے پروردگار! میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا تو مجھے بخش دے تو خدا نے ان کو بخش دیا بے شک وہ بخشنے والا مہربان ہے۔
انبیاء علیہم السلام کی طرف جو اعتراضات منسوب کیے جاتے ہیں تو یہ عمل خلاف اولیٰ ہے، یعنی اس کام کو نہ کرنا بہتر تھا۔

ہم لوگوں کے جنت میں جانے کے ذمہ دار نہیں ہیں

قرآن کریم ایک خاص خوبصورتی کی ساتھ کہتا ہے: **إِنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۖ فَمَنِ اهْتَدَىٰ فَلِنَفْسِهِ ۖ وَمَنْ ضَلَّٰ فَإِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهِ ۖ وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ ٤٤** (سورہ زمر)

ترجمہ: ہم نے تم پر کتاب لوگوں (کی ہدایت) کے لئے سچائی کے ساتھ نازل کی ہے، تو جو شخص ہدایت پاتا ہے تو اپنے (بھلے کے) لئے اور جو گمراہ ہوتا ہے اپنا ہی نقصان کرتا ہے، اور (اے پیغمبر) تم ان کے ذمہ دار نہیں ہو۔
مفسرین کرام اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ بنیادی طور پر قرآن کریم بشریت کی رہنمائی کیلئے نازل ہوا ہے، "إِنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ"۔
ترجمہ: ہم نے تم پر کتاب لوگوں (کی ہدایت) کے لئے سچائی کے ساتھ نازل کی ہے۔

یقیناً یہ پر عظمت کتاب ہے اور معجزات سے بھری ہوئی ہے، اس میں باطل اور بے معنی چیزیں نہیں ہے۔

بشریت کی ہدایت اور رہنمائی کیلئے تجھ پر اتارا ہے، اہل علم کا کھنا ہے کہ مذکورہ آیت میں لفظ "حق" کے بارے میں دو تفسیریں ہیں:

1۔ سب سے پہلے قرآن عظیم کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول اور ترسیل حق کے ساتھ ہوئی ہے، اور اس میں کسی قسم کا کوئی باطل نہیں ہے۔

2۔ دوم یہ ہے کہ یہ کتاب حق ہے: **(ذَلِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ)** ہے، قرآن کریم حق اور اس میں کسی بھی قسم کے شک اور تردد کی گنجائش نہیں ہے، اور متقیوں کی رہنمائی کیلئے اتری ہے، اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ یہ کتاب: یعنی قرآن عظیم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر بشریت کی ہدایت اور رہنمائی کے واسطے نازل ہوئی ہے، چنانچہ انسانوں پر لازم ہے کہ ہدایت اور رہنمائی اس کتاب سے حاصل کریں۔

اور جو کچھ انسان کی گمراہی اور ضلالت کا سبب بنتا ہے اس سے بچیں اور دوری اختیار کریں، قرآن کریم کو سمجھنا اور اپنی زندگی کو قرآن کریم کے منطقی فہم پر استوار کرنا ضروری ہے کہ جس چیز کی طرف یہ کتاب ہمیں دعوت دیتی ہے، اس کی طرف جانا چاہیے اور اس پر عمل کرنا چاہیے۔

اور جس چیز سے ڈراتی اور منع کرتی ہے اس کی تنبیہات کو سنجیدگی سے لینا چاہیے ، اور ان ممنوعات کے انجام سے اپنے آپ کو بچانا چاہیے ، جن ممنوعات کو قرآن نے بیان کیا ہے ۔

جس چیز کی طرف قرآن کریم ہمیں بلاتا ہے ، اسے رُشد و ہدایت جاننا چاہیے اور جس سے ہمیں ڈراتا دھمکاتا ہے اسے باطل سمجھنا چاہیے اور اس سے دوری اختیار کرنا چاہیے ۔

اگلی آیت کریمہ میں ہے کہ : "فَمَنْ اهْتَدَىٰ فَلِنَفْسِهِ" پھر جو شخص اور انسان ہدایت کا راستہ اختیار کرتا ہے ، اور دلیل و بُرہان کے ساتھ حق کی طرف دوڑتا ہے ، یہ اس کے فائدے میں ہوگا ، کیونکہ یہ ایک علمی اصول ہے : کہ حق قبول کرنے کا نتیجہ انسان کو ہی ملتا ہے ۔

(وَمَنْ ضَلَّ فَانْمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا) اور جو شخص گمراہ ہوا حق اور کلام الہی سے سرکشی کی اور منحرف ہوا تو بالآخر یہ اس کے لیے نقصان کا سبب بنے گا ، نتیجتاً ایک گمراہ شخص شمار کیا جائیگا ۔

دوسرے لفظوں میں وہ اپنی منحرف عمل کی سزا چکھے گا ، (وَمَا أَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيلٍ)

ترجمہ: اے رسول! تو ان پر ذمہ دار نہیں ہے ، یعنی حق کو ان کے دل میں پہنچانے کی ذمہ داری آپ کی نہیں ہے ، یا یہ کہ آپ کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ ان کی ہمیشہ سے نگرانی کریں کہ وہ منحرف نہ ہوں ۔

کیونکہ آپ ان کو زبردستی اسلام اور ایمان قبول کرنے پر مجبور نہیں کرسکتے ، آپ کا کام صرف اور صرف آسمان سے آیا ہوا پیغام ان تک پہنچانا ہے ، نہ آپ ان کے دلوں کے نگران ہو اور نہ ان کو حق قبول کرنے پر مجبور کرسکتے ہو ۔

ایمان ایک معاہدہ ہے ، اور یہ دل اور باطن کا عزم ہے ، جسے انسان اپنی مرضی سے قبول کرتا ہے ، اسی وجہ سے اسلام جو کہ ایک مقدس دین ہے جبری ایمان کو قبول نہیں کرتا ، ہمارے رب عظیم نے انسان کو آزاد چھوڑا ہے تا کہ اپنی تحقیق سے دین منتخب کرے ۔

قرآن کریم کے منطقی فہم کے مطابق جن لوگوں نے کسی ناحق دین کا انتخاب کیا ہے ، ان کو کافر اور جن لوگوں نے درست اور برحق دین کا انتخاب کیا ہے انہیں مؤمن کہا جاتا ہے ۔

اس حساب سے کوئی مسلمان تو ہوسکتا ہے ، اور حق کے سامنے سرتسلیم خم کرسکتا ہے ، لیکن مؤمن نہیں ہوسکتا ہے ، جیسا کہ ہم نے بتایا: مؤمن وہ اندرونی عہد اور معاہدہ اور رشتہ ہے جس معاہدے کی صداقت کے بارے میں اللہ تعالیٰ اور خود شخص مؤمن جانتا ہے ۔

دین اسلام نے ایک قاعدہ اور قانون وضع کر دیا ہے دین کے انتخاب کے لیے ، اس قانون کی بنیاد سورہ بقرہ کی آیت "256" میں بہت عمدگی سے بیان کی گئی ہے، رب عظیم فرماتے ہیں: "لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ" ۝ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۝...

آیت مبارکہ کا شأن نزول :

یہ سورہ بقرہ کی آیت ہے اور یہ سورت ہجرت کے بعد مدینہ میں نازل ہونا شروع ہوئی، اس سورت کا نزول تب شروع ہوا جب اسلامی حکومت اور نظام تشکیل کے مراحل میں تھا۔

مفسرین کہتے ہیں کہ : یہ آیت اہل مدینہ اور بنی سالم بن عوف کے قبیلے سے ایک شخص جس کا نام "حصین" ہے کہ بارے میں نازل ہوئی ہے، قصہ کچھ اس طرح ہے کہ "حصین" خود تو مسلمان ہوا تھا ، لیکن اس کے دونصرانی بیٹے ابھی تک اسلام کی طرف مائل نہیں ہوئے تھے، اس آدمی نے اس واقعے کا پیارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کیا اور کہا: اے اللہ کے رسول! کیا ان دونوں کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کرسکتا ہوں، کیونکہ وہ دونوں نصرانیت کے علاوہ کسی دوسرے دین کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں ؟ اس کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی : "لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ" ۝ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۝...

اسی طرح بعض مفسرین اس کے شأن نزول کے بارے میں کہتے ہیں کہ : انصار کے ایک آدمی کا ایک سیاہ فام غلام تھا، جس کا نام "صبیح" تھا، وہ انصاری چاہتے تھے کہ اسے زبردستی اسلام لانے پر مجبور کریں، اسی اثناء میں یہ آیت نازل ہوئی تو "صبیح" اور تمام مسلمانوں کو ہدایت دی گئی کہ دین اسلام قبول کرنے کے لیے لوگوں پر کوئی جبر و زبردستی نہ کریں، اور فرمایا کہ : انسانوں کو مکمل آزادی و اختیار حاصل ہے۔

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بوڑھی نصرانی عورت کو اسلام کی دعوت دی، تو بوڑھی عورت نے جواب میں کہا: "أنا عجوزٌ كبيرةٌ والموت اقرب الی" حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس بوڑھی عورت کا جواب سننے کے بعد اسے ایمان لانے پر مجبور نہیں کیا، بلکہ اس آیت مبارکہ کی تلاوت کی: "لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ" ۝ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۝...

یعنی دین میں کوئی چیز جبری نہیں ہے، اور حقیقت میں ایمان قبول کرانے پر کوئی زور و زبردستی کام نہیں آئے گا۔

دین اسلام نے ایمان کو ظاہری اعضاء کے ساتھ مربوط نہیں رکھا ہے، بلکہ ایمان اور عدم ایمان ان امور میں سے ہے جن کا تعلق انسان کی اندرونی چاہت اور رضا کی ساتھ ہے۔

جیسا کہ رب تعالیٰ فرماتے ہیں : "وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَبِّكُمْ ۝ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَمَنْ شَاءَ فَلْيُكْفُرْ ۝" (کھدو: حق (وہی ہے جو) رب کی طرف سے (آیا) ہے ، (اور میں اسے اپنے ساتھ لایا ہوں جو کہ میرا اور تمام مؤمنین کا مشن ہے) پس جو چاہے اس پر ایمان لائے اور جو چاہے اس کا انکار کر دے (سورۃ الکہف : 29)۔

قرآن کریم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حیثیت کو واضح کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد فقط تبلیغ کرنا اور دعوت دینا ہے ، کسی کو زور و زبردستی کے ساتھ اسلام لانے پر مجبور کرنا نہیں : "أَفَأَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتَّى يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ ۝۹۹" (یونس: آیہ ۹۹) اے پیغمبر ! کیا تم چاہتے ہو کہ لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کر دو ، (یہ کام نہ تو درست ہے نہ فائدہ والا ہے اور نہ ہی تیرا کام ہے) ۔

پھر سورۃ الغاشیہ (آیت : 22) میں فرماتے ہیں : "لَسْتُ عَلَيْهِمْ بِمُصَيِّرٍ ۝۲۲" آپ ان پر غلبہ نہیں رکھتے۔

اسی طرح سورۃ الشوری میں فرماتے ہیں : "فَإِنْ أَعْرَضُوا لَسْتُ عَلَيْهِمْ بِمُصَيِّرٍ ۝۲۲" ا فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ حَفِيظًا ۝ إِنْ عَلَيْكَ إِلَّا الْبَلَاغُ ۝" اگر مشرکین آپ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کریں (کوئی مسئلہ نہیں ہے غمگین مت ہو) کیونکہ ہم نے آپ کو ان کی مراقبت اور نگرانی کے لیے نہیں بھیجا ہے ، آپ کا کام پیغام پہنچانا ہے۔

اسی طرح قرآن کریم میں سورۃ مزمل (آیت : 19) میں فرماتے ہیں : "فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذْ إِلَىٰ رَبِّهِ سَبِيلًا ۝۱۹" پھر جو چاہے بنالے اپنے رب کی طرف راہ ۔ اس آیت مبارکہ میں "من شاء" کا جملہ دلیل ہے انسان کی آزادی اور اختیار پر کفر اور ایمان اختیار کرنے پر ، "إِنَّا بِدِينِهِ الْسَّبِيلَ إِمَّا شَاكِرًا وَإِمَّا كَفُورًا ۝۳۱" ترجمہ: ہم نے انسان کو راہ دکھائی ہے چاہے شکر گزار بنے (قبول کرے) یا (مخالفت کرے) انکار کرے ۔

حق اور باطل کے راستے ایک دوسرے سے الگ ہو چکے ہیں ، دونوں راستوں کی پہچان کرادی گئی ہے ، ان میں سے ہر ایک کا انتخاب انسان کے اختیار میں ہے ، وہ مجبور نہیں ہے ، جس راستے کا چاہے انتخاب کرے ، البتہ اگر انسان نے حق اور حقیقت کا راستہ اپنایا تو جنت اور ہمیشہ والی سعادت کو پالے گا۔

اور اگر باطل راستے کا انتخاب کیا تو پھر جہنم اور ہمیشہ والی بدبختی میں گرفتار ہوگا ، قرآن کریم نے ایک سو بیس (120) سے زیادہ آیتوں میں یہ تاکید کی ہے کہ اسلام قلبی اطمینان اور خالص پاکیزہ تعلیم کی بنیاد پر پھیلا ہے ۔

اور اسلام کو لوگوں میں متعارف کروانے کے بعد انہیں تمام اور مکمل اختیار دیا گیا ہے کہ وہ اس کے بعد دین کو قبول کرنے میں آزاد ہیں۔
 اسی رویہ اور عظیم انسانی منطق کے سبب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد اہل مکہ کو اپنی حالت پر چھوڑ دیا ، اور فرمایا : «اذهبوا فأنتم الطلقاء» "جاؤ آپ لوگ آزاد ہو، اس عظیم فتح کے بعد کسی کو زبردستی اسلام لانے پر مجبور نہیں کیا۔

صدق الله العظيم وصدق رسوله النبي الكريم

ترجمہ و تفسیر «سورة عَبَسَ»

تتبع و نگارش: امین الدین « سعیدی - سعید افغانی »

مدیر مرکز مطالعات ستراتیژیکی افغان

و مسؤل مرکز فرهنگى د حق لاره- جرمنى

ادرس : saidafghani@hotmail.com

Get more e-books from www.ketabton.com
Ketabton.com: The Digital Library